

تلخيص

تفہیم الولان

ترجمہ و تفسیر

سید ابوالاعلم مودودی

تلخيص

مولانا صدر الدين اصلاحی

ہود

زمانہ نزول

اس سورے کے مضمون پر غور کرنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ اسی دور میں نازل ہوئی ہوگی جس میں ”سورہ یونس“، نازل ہوئی تھی۔ بعد نہیں کہ یہ اس کے ساتھ متعلقاً ہی نازل ہوئی ہو، کیونکہ موضوع تقریر وہی ہے، مگر تنبیہ کا انداز اس سے زیادہ سخت ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نے نبی ﷺ سے عرض کیا ”میں دیکھتا ہوں کہ آپ بوزھے ہوتے جا رہے ہیں، اس کی کیا وجہ ہے؟“ جواب میں حضور نے فرمایا شیئتُنی هُوْدُ وَ أَخْوَاتُهَا، ”مجھ کو سورہ ہواد اور اس کی ہم مضمون سورتوں نے بوڑھا کر دیا ہے۔“ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نبی ﷺ کے لیے وہ زمانہ کیسا ساخت ہو گا جب کہ ایک طرف کفار قریش اپنے تمام تھیاروں سے اس دعوتِ حق کو کچل دینے کی کوشش کر رہے تھے اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ پے در پے تنبیہات نازل ہو رہی تھیں۔ ان حالات میں آپؓ کو ہر وقت یہ اندر یہ گھلائے دیتا ہو گا کہ کہیں اللہ کی دی ہوئی مهلت ختم نہ ہو جائے اور وہ آخری ساعت نہ آجائے جب کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کو عذاب میں کپڑے لینے کا فیصلہ فرمادیتا ہے۔ فی الواقع اس سورے کو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ایک سیالاً بندوٹنے کو ہے اور اس عانفل آبادی کو، جو اس سیالاً کی زد میں آنے والی ہے، آخری تنبیہ کی جاری ہے۔

موضوع اور مباحث

موضوع تقریر، جیسا کہ ابھی بیان کیا جا چکا ہے، وہی ہے جو سورہ یونس کا تھا۔ یعنی دعوت، فہماش اور تنبیہ۔ لیکن فرق یہ ہے کہ سورہ یونس کی نسبت یہاں دعوت مختصر ہے، فہماش میں استدلال کم اور عظاً و نصیحت زیادہ ہے، اور تنبیہ مفصل اور پر زور ہے۔ دعوت یہ ہے کہ پیغمبر کی بات مانو، شرک سے بازاً جاؤ، سب کی بندگی چھوڑ کر اللہ کے بندے بنو اسرائیل آبادی کو، جو اس سیالاً کا سارا نظام آخرت کی جواب دنی کے احساس پر قائم کرو۔

فہماش یہ ہے کہ حیات دنیا کے ظاہری پہلو پر اعتماد کر کے جن قوموں نے اللہ کے رسولوں کی دعوت کو ٹھکرایا ہے وہ اس سے پہلے نہایت بر انجام دیکھ چکی ہیں، اب کیا ضرور ہے کہ تم بھی اسی راہ پر چلو جسے تاریخ کے مسلسل تجربات قطعی طور پر بتاہی کی راہ ثابت کر چکے ہیں۔

تبیہ یہ ہے کہ عذاب کے آنے میں جو تاخیر ہو رہی ہے یہ دراصل ایک مہلت ہے جو اللہ اپنے فضل سے تمہیں عطا

کر رہا ہے۔ اس مہلت کے اندر اگر تم نہ سنبھلے تو وہ عذاب آئے گا جو کسی کے ٹالے نہیں سکے گا اور اہل ایمان کی مٹھی بھر جماعت کو چھوڑ کر تمہاری ساری قوم کو صفحہ ہستی سے مٹا دے گا۔

اس مضمون کو ادا کرنے کے لیے براہ راست خطاب کی نسبت قوم نوح، عاد، شمود، قوم لوط، اصحاب مدین اور قوم فرعون کے تصویں سے زیادہ کام لیا گیا ہے۔ ان تصویں میں خاص طور پر جوبات نمایاں کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ خدا جب فیصلہ چکانے پر آتا ہے تو پھر بالکل بے لाग طریقہ سے چکاتا ہے۔ اس میں کسی کے ساتھ ذرہ برابر عایت نہیں ہوتی۔ اس وقت یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کون کس کا بیٹا اور کس کا عزیز ہے۔ رحمت صرف اس کے حصہ میں آتی ہے جو راست پر آ گیا ہو، ورنہ خدا کے غضب سے نہ کسی پیغمبر کا بیٹا بچتا ہے اور نہ کسی پیغمبر کی بیوی۔ یہی نہیں بلکہ جب ایمان و کفر کا دوڑوک فیصلہ ہو رہا ہو تو دین کی فطرت یہ چاہتی ہے کہ خود موسیٰ بھی باپ اور بیٹے اور شوہر اور بیوی کے رشتاؤں کو بھول جائے اور خدا کی شمشیر عدل کی طرح بالکل بے لाग ہو کر ایک رشته حق کے سواہر دوسرے رشته کو کاٹ پھینکے۔ ایسے موقع پر خون اور نسب کی رشته دار یوں کا ذرہ برابر لحاظ کر جانا اسلام کی روح کے خلاف ہے۔ یہی وہ تعلیم تھی جس کا پورا پورا مظاہرہ تین چار سال بعد مکہ کے مہاجر مسلمانوں نے جنگ بدر میں کر کے دکھادیا۔

الْيَوْمَ هُوَ دِيْنُكُمْ كُلُّهُمْ رَبُّ عَنْهُمْ لَا يَنْهَا ۝ (۵۲) سُورَةُ الْحُجَّةِ ۝ ۱۲۳

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الْأَرْقَفِ كَيْتَ أَحْكَمْتَ أَيْنَهُ ثُمَّ فَصَلَتْ مِنْ لَدُنْ حَكِيمٍ خَيْرٍ لِّا
تَعْبُدُ وَإِلَّا اللَّهُ إِنَّمَا لَكُمْ فِتْنَةُ نَذِيرٍ وَّبَشِيرٍ لَّا وَإِنْ أَسْتَغْفِرُوا
رَبِّكُمْ ثُمَّ تُوَبُّوْا إِلَيْهِ يُمْتَعَكُمْ مَتَاعًا حَسَنًا إِلَى أَجَلٍ مُّسَمًّى وَيُؤْتَ
كُلَّ ذِي فَضْلَةٍ وَإِنْ تَوَتُّوْ فَإِنَّمَا خَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابٌ يَوْمٌ

اللہ کے نام سے جو بے انتہا ہربیان اور حرم فرمانے والا ہے۔

[۱] اے، ر-فرمان [۱] ہے، جس کی آیتیں پختہ اور مفصل ارشاد ہوئی ہیں، [۲] ایک دانا اور باخبر ہستی کی طرف سے کتم نہ بندگی کرو مگر صرف اللہ کی۔ میں اس کی طرف سے تم کو خبردار کرنے والا بھی ہوں اور بشارت دینے والا بھی۔ اور یہ کہ تم اپنے رب سے معافی چاہو اور اس کی طرف پلٹ آ تو وہ ایک مدت خاص تک تم کو اچھا سامان زندگی دے گا [۳] اور ہر صاحب فضل کو اس کا فضل عطا کرے گا۔ [۴] لیکن اگر تم منہ پھیرتے ہو تو میں تمہارے حق میں ایک بڑے ہولناک دن کے عذاب سے

[۱] ”کتاب“ کا ترجمہ یہاں انداز بیان کی مناسبت سے ”فرمان“ کیا گیا ہے۔ عربی زبان میں یہ لفظ کتاب اور نوشته ہی کے معنی میں نہیں آتا بلکہ حکم اور فرمان شاہی کے معنی میں بھی آتا ہے اور خود قرآن میں متعدد مواقع پر یہ لفظ اسی معنی میں مستعمل ہوا ہے۔

[۲] یعنی اس فرمان میں جو باتیں بیان کی گئی ہیں وہ پکی اور اٹلیں ہیں۔ خوب بچی تی ہیں۔ اور اس کا ایک لفظ بھی ایسا نہیں جو حقیقت سے کم یا زیادہ ہو۔ پھر یہ آیتیں مفصل بھی ہیں، ان میں ایک ایک بات کھول کھول کرو اس طریقے سے ارشاد ہوئی ہے۔ بیان {میں کوئی اچھا و ہے اور نہ کوئی ابھا۔}

[۳] یعنی دنیا میں تمہارے پھیرنے کے لیے جو وقت مقرر ہے اس وقت تک وہ تم کو بری طرح نہیں بلکہ اچھی طرح رکھے گا۔ اس کی نعمتیں تم پر بریں گی۔ اس کی برکتوں سے سرفراز ہو گے۔ خوش حال و فارغ الابل رہو گے۔ زندگی میں امن اور چیزوں نصیب ہو گا۔ ذلت و خواری کے ساتھ نہیں بلکہ عزت و شرف کے ساتھ جیو گے۔ یہی مضمون (انل ۹۷) میں بھی ارشاد ہوا ہے۔ اس سے لوگوں کی اُس عام غلط فہمی کو رفع کرنا مقصود ہے جو شیطان نے ہر نادان پرست آدمی کے کان میں پھوک رکھی ہے کہ خدا تعالیٰ اور راست بازی اور احساس ذمہ داری کا طریقہ اختیار کرنے سے آدمی کی آخرت بنتی ہو تو نہیں ہو، مگر دنیا ضرور بگڑ جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی تردید میں فرماتا ہے کہ آخرت کی طرح اس دنیا کی حقیقی عزت کا میابی بھی ایسے ہی لوگوں کے لیے ہے جو سچی خدا پرستی کے ساتھ صالح زندگی بسر کریں۔ {متاع حسن اچھا سامان زندگی قرآن کی زبان میں اس سامان زندگی کو کہا جاتا ہے} جو شخص عیش دنیا ہی پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ نتیجہ میں عیش آخرت کا بھی ذریعہ نہتا ہے۔

[۴] یعنی جو شخص اخلاق و اعمال میں جتنا بھی آگے بڑھے گا اللہ اس کو اتنا ہی بڑا درجہ عطا کرے گا۔ جو شخص بھی اپنی سیرت و کردار سے اپنے کو جس فضیلت کا مُتْحَقَّ ثابت کر دے گا وہ فضیلت اس کو ضرور وی جائے گی۔

كَبِيرٌ ۝ إِلَى اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ ۝ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ أَلَا إِنَّهُمْ
يَتَنَوَّنُونَ صُدُورَهُمْ لِيُسْتَحْفَوْا مِنْهُ ۝ أَلَا حَيْنَ يَسْتَغْشُونَ شَيَّاً بِهِمْ
يَعْلَمُ مَا يُسْرُونَ ۝ وَمَا يُعْلَمُونَ ۝ إِنَّهُ عَلَيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ۝
وَمَا مِنْ دَآبَةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رُزْقُهَا
وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ۝ كُلُّ فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ ۝
وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سَتَةِ أَيَّامٍ ۝ وَكَانَ

ذرتا ہوں۔ تم سب کو اللہ کی طرف پلٹنا ہے اور وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔

دیکھو! یہ لوگ اپنے سینوں کو موڑتے ہیں تاکہ اس سے چھپ جائیں^[۵]۔ خبردار! جب یہ کپڑوں سے اپنے آپ کوڈھانپتے ہیں، اللہ ان کے چھپے کو بھی جانتا ہے اور کھلے کو بھی، وہ تو ان بھیدوں سے بھی واقف ہے جو سینوں میں ہیں۔ زمین میں چلنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں ہے جس کا رزق اللہ کے ذمے نہ ہو اور جس کے متعلق وہ نہ جانتا ہو کہ کہاں وہ رہتا ہے اور کہاں وہ سونپا جاتا ہے، سب کچھ ایک صاف دفتر میں درج ہے۔

اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھپ دنوں میں پیدا کیا جب کہ

[۵] کے میں جب نبی ﷺ کی دعوت کا چرچا ہوا تو بہت سے لوگ دہا ایسے تھے جو مخالفت میں تو کچھ بہت زیادہ سرگرم نہ تھے مگر آپ کی دعوت سے سخت بیزار تھے۔ ان لوگوں کا روایہ یہ تھا کہ آپ سے کرتا تھے، آپ کی کسی بات کو سننے کے لیے تیار نہ تھے، کہیں آپ کو بیٹھے تو اپنے پاؤں پھر جاتے، دور سے آپ کو آتے دیکھ لیتے تو رخ بدلتے یا کپڑے کی اوٹ میں منہ چھپا لیتے، تاکہ ان سے آپ کا آمنا سامانہ ہو جائے اور آپ انھیں مخاطب کر کے کچھ اپنی باتیں نہ کہنے لگیں۔ اسی فرم کے لوگوں کی طرف یہاں اشارہ کیا ہے کہ یہ لوگ حق کا سامنا کرنے سے گھبرا تے ہیں اور شتر مرغ کی طرح منہ چھپا کر سمجھتے ہیں کہ وہ حقیقت ہی غائب ہو گئی جس سے انہوں نے منہ چھپایا ہے۔ حالاں کہ حقیقت اپنی جگہ موجود ہے اور وہ یہ بھی دیکھ رہی ہے کہ یہ بے وقوف اس سے بچنے کے لیے منہ چھپائے بیٹھے ہیں۔

[۶] یعنی جس خدا کے علم کا حال یہ ہے کہ ایک ایک چڑیا کا گھونسلہ اور ایک ایک کیڑے کا بل اس کو معلوم ہے اور وہ اسی کی جگہ پر اس کو سامان زیست پہنچا رہا ہے، اور جس کو ہر آن اس کی خبر ہے کہ کون سا جاندار کہاں رہتا ہے اور کہاں اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دیتا ہے، اس کے متعلق اگر تم یہ گمان کرتے ہو کہ اس طرح منہ چھپا چھپا کریا کانوں میں انگلیاں ٹھوٹیں کریا آنکھوں پر پر دہ ذاں کرم اس کی کپڑے سے نقے جاؤ گے تو سخت نادان ہو۔ دائیٰ حق سے تم نے منہ چھپا بھی لیا تو آخراں کا حاصل کیا ہے؟ کیا خدا سے بھی تم چھپ گئے؟ کیا خدا یہ نہیں دیکھ رہا ہے کہ ایک شخص تمہیں امر حق سے آگاہ کرنے میں لگا ہوا ہے اور تم یہ کوشش کر رہے ہو کہ کسی طرح اس کی کوئی بات تمہارے کان میں نہ پڑنے پائے؟

عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ لِيَبْلُو كُمْ أَحْسَنُ عَمَلاً طَوَّلَتْ قُلْتَ
إِنَّكُمْ مَبْعُوثُونَ مِنْ بَعْدِ الْمَوْتِ لَيَقُولُنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا
إِنْ هُذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ ۝ وَلَيَنْ أَخْرَنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ إِنَّ
أُمَّةَ مَعْدُودَةً لَيَقُولُنَّ مَا يَحْسُدُهُ طَالَ يَوْمُ يَأْتِيهِمْ لَيْسَ
عَلَىٰ مَصْرُوفًا غَائِبُهُمْ وَحَاقَ بِهِمْ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهِزُونَ ۝

اس سے پہلے اس کا عرش پانی پر تھا [۷] — تاکہ تم کو آزمائ کر دیکھے تم میں کون بہتر عمل کرنے والا ہے۔ [۸] اب اگر اے نبی، تم کہتے ہو کہ لوگوں، مرنے کے بعد تم دوبارہ اٹھائے جاؤ گے، تو مکرین فوراً بول اٹھتے ہیں کہ یہ تو صریح جادوگری ہے۔ اور اگر ہم ایک خاص مدت تک ان کی سزا کوٹلتے ہیں تو وہ کہنے لگتے ہیں کہ آخر کس چیز نے اسے روک رکھا ہے؟ سنو! جس روز اُس سزا کا وقت آگیا تو وہ کسی کے پھیرے نہ پھر سکے گا اور وہی چیزان کو آگھیرے گی جس کا وہ مذاق اڑا رہے ہیں ۹

[۷] جملہ مفترض ہے جو غالباً لوگوں کے اس سوال کے جواب میں فرمایا گیا ہے کہ آسمان و زمین اگر پہلے نہ تھے اور بعد میں پیدا کیے گئے تو پہلے کیا تھا؟ اس سوال کو یہاں نقل کیے بغیر اس کا جواب اس مختصر سے فقرے میں دے دیا گیا ہے کہ پہلے پانی تھا۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس پانی سے مراد کیا ہے۔ یہی پانی جسے ہم اس نام سے جانتے ہیں؟ یا یہ لفظ شخص استعارے کے طور پر مادے کی اس مائع (Fluid) حالت کے لیے استعمال کیا گیا ہے جو موجودہ صورت میں ڈھالے جانے سے پہلے تھی؟ رہایہ ارشاد کہ خدا کا عرش پہلے پانی پر تھا، تو اس کا مفہوم ہماری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ خدا کی سلطنت پانی پر تھی۔

[۸] اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کو اس لیے پیدا کیا کہ تم کو (انسان کو) پیدا کرنا مقصود تھا، اور تمہیں اس لیے پیدا کیا کہ تم پر اخلاقی ذمہ داری کا بارہ لا جائے، تم کو خلافت کے اختیارات پر دیکھائیں اور پھر دیکھا جائے کہ تم میں سے کون ان اختیارات کو اور اس اخلاقی ذمہ داری کے بوجھ کو کس طرح سنبھالتا ہے۔ اگر اس تھیق کی تہہ میں یہ مقصد نہ ہوتا، اگر اختیارات کی تفہیض کے باوجود کسی امتحان کا، کسی محاسبہ اور باز پرس کا اور کسی جزا اور سزا کا کوئی سوال نہ ہوتا، اور اگر انسان کو اخلاقی ذمہ داری کا حال ہونے کے باوجود یونہی بنیجہ مرکر مٹی ہو جانا ہی ہوتا، تو پھر یہ سارا کار تخلیق بالکل ایک مہل کھیل تھا اور اس تمام ہنگامہ وجود کی کوئی حیثیت ایک فعل عہد کے سوانح تھی۔

[۹] یعنی ان لوگوں کی نادانی کا یہ حال ہے کہ کائنات کو ایک کھنڈرے کا گھر وند اور اپنے آپ کو اس کے جی بہلانے کا کھلونا سمجھے بیٹھے ہیں اور اس احتمانہ تصور میں اتنے مگن ہیں کہ جب تم انہیں اس کارگاہ حیات کا سنجیدہ مقصد، اور خود ان کے وجود کی معقول غرض و غایت سمجھاتے ہو تو قہقهہ لگاتے ہیں اور تم پر چھتی کرتے ہیں کہ یہ شخص تو جادو کی سی باتیں کرتا ہے۔

وَلَيْسُ أَذْقَنَا إِلَّا إِنْسَانٌ مَنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنَاهَا مِنْهُ ۝ إِنَّهُ لَيَوْسٌ
كَفُورٌ ۝ وَلَيْسُ أَذْقَنَهُ نَعْمَاءٌ بَعْدَ ضَرَّاءٍ مَسْتَهُ لَيَقُولَنَّ
ذَهَبَ السَّيِّاتُ عَيْنٌ ۝ إِنَّهُ لَفَرِحٌ فَخُورٌ ۝ إِلَّا الَّذِينَ
صَبَرُوا وَعَمِلُوا الصِّلْحَتِ ۝ أَوْلَئِكَ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ

اگر کبھی ہم انسان کو اپنی رحمت سے نوازنے کے بعد پھر اس سے محروم کر دیتے ہیں تو وہ مایوس ہوتا ہے اور ناشکری کرنے لگتا ہے۔ اور اگر اس مصیبت کے بعد جو اس پر آئی تھی ہم اسے نعمت کا مزاچھاتے ہیں تو کہتا ہے کہ میرے تو سارے دلدار پار ہو گئے، پھر وہ پھولانہیں سما تا اور اکثر نے لگتا ہے^[۱]۔ اس عیب سے پاک اگر کوئی ہیں تو بس وہ لوگ جو صبر کرنے والے^[۲] اور نیکوکار ہیں اور وہی ہیں جن کے لیے درگز بھی ہے اور بڑا اجر بھی^[۳]۔

[۱۰] یہ انسان کے مچھوڑے پن، سطح بینی، اور قلت مدرک کا حال ہے جس کا مشاہدہ ہر وقت زندگی میں ہوتا رہتا ہے۔ اور جس کو عام طور پر لوگ اپنے نفس کا حساب لے کر خود اپنے اندر بھی محسوس کر سکتے ہیں۔ آج خوش حال اور روز آور ہیں تو اکثر ہے ہیں فخر کر رہے ہیں۔ ساون کے اندر ہے کی طرح ہر طرف ہر ایسی اہناظر آ رہا ہے اور خیال تک نہیں آتا کہ کبھی اس بہار پر خزان بھی آسکتی ہے۔ کل کسی مصیبت کے پھیلیں آگئے تو بلبا اٹھے، حسرت و یاس کی تصویر ہن کر رہے گئے، اور بہت تعلماۓ تو خدا کو گالیاں دے کر اور اس کی خدا تعالیٰ پر طعن کر کے غم غلط کرنے لگے۔ پھر جب برا وقت گزر گیا اور بھلے دن آئے تو وہی اکثر، وہی ڈیگیں اور نعمت کے نئے میں وہی سرستیاں پھر شروع ہو گئیں۔ انسان کی اس ذلیل صفت کا یہاں کیوں ذکر ہو رہا ہے؟ اس کی غرض ایک نہایت لطیف انداز میں لوگوں کو اس بات پر متنبہ کرنا ہے کہ آج اطمینان کے ماحول میں جب ہمارا پیغمبر تھیں خبردار کرتا ہے کہ خدا کی نافرمانیاں کرتے رہو گے تو تم پر عذاب آئے گا، اور تم اس کی یہ بات سن کر ایک زور کا لٹھھما رتے ہو اور کہتے ہو کہ ”دیوانے دیکھنیں کہ ہم پر نعمتوں کی باش ہو رہی ہے، ہر طرف ہماری بڑائی کے پھریے اُڑ رہے ہیں، اس وقت تجھے دن دھاڑے یہ دڑاونا خواب کیے نظر آ گیا کہ کوئی عذاب ہم پر ثوٹ پڑنے والا ہے“، تو دراصل پیغمبر کی نصیحت کے جواب میں تمہارا یہ لٹھھا اسی ذلیل صفت کا ایک ذلیل تمظاہر ہے۔ خدا تو تمہاری مگر ایوں اور بدکاریوں کے باوجود محض اپنے رحم و کرم سے تمہاری سزا میں تاخیر کر رہا ہے تاکہ تم کسی طرح سنبھل جاؤ، مگر تم اس مہلت کے زمانے میں یہ سوچ رہے ہو کر ہماری خوش حالی کیسی پاسیدار نہیاں دوں پر قائم ہے اور ہمارا یہ چن کیسا سدا بہار ہے کہ اس پر خزان آنے کا کوئی خطرہ ہی نہیں۔

[۱۱] یہاں صبر کے ایک اور مفہوم پر روشنی پڑتی ہے۔ صبر کی صفت اس مچھوڑے پن کی ضد ہے جس کا ذکر اور پر کیا گیا ہے۔ صابر وہ شخص ہے جو زمانہ کے بدلتے ہوئے حالات میں اپنے ذہن کے توازن کو برقرار رکھے۔ وقت کی ہر گردش سے اثر لے کر اپنے مزاج کا رنگ بدلتا نہ چلا جائے بلکہ ایک معقول اور صحیح روایہ پر ہر حال میں قائم رہے۔ اگر کبھی حالات سازگار ہوں اور وہ دولت مندی، اقتدار اور ناموری کے آسمانوں پر چڑھا چلا جا رہا ہو تو بڑائی کے نئے میں مست ہو کر بینکنے نہ لگے۔ اور اگر کسی دوسرے وقت مصائب و مشکلات کی پچک اسے پیے ڈال رہی ہو تو اپنے جو ہر انسانیت کو اس میں ضائع نہ کر دے۔ خدا کی طرف سے آزمائش خواہ نعمت کی صورت میں آئے یا مصیبت کی صورت میں، دونوں صورتوں میں اس کی بردباری اپنے حال پر قائم رہے اور اس کا ظرف کسی چیز کی بھی چھوٹی یا بڑی مقدار سے چھلک نہ پڑے۔

[۱۲] یعنی اللہ ایسے لوگوں کے صور معاف بھی کرتا ہے اور ان کی بھلاکیوں پر اجر بھی دیتا ہے۔

گَيْرِ ۝ فَلَعَلَّكَ تَارِكٌ بَعْضَ مَا يُوحَى إِلَيْكَ وَضَائِقٌ بِهِ
صَدْرُكَ أَنْ يَقُولُوا لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ كُنْزٌ أَوْ جَاءَ مَعَهُ
مَلَكٌ ظِلْلَمٌ أَنَّتَ نَذِيرٌ وَاللَّهُ عَلَىٰ حِلٍّ شَفِيعٌ وَكَيْلٌ ۝ ۱۲

تو اے پیغمبر، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم ان چیزوں میں سے کسی چیز کو (بیان کرنے سے) چھوڑ دو جو تمہاری طرف وحی کی جا رہی ہیں اور اس بات پر دل تنگ ہو کر وہ کہیں گے ”اس شخص پر کوئی خزانہ کیوں نہ اتا را گیا“، یا یہ کہ ”اس کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہ آیا۔“ تم تو محض خبردار کرنے والے ہو، آگے ہر چیز کا حوالہ دار اللہ ہے۔^[۳]

[۱۲] اس ارشاد کا مطلب سمجھنے کے لیے ان حالات کو پیش نظر رکھنا چاہیے جن میں یہ فرمایا گیا ہے۔ مکہ ایک ایسے قبیلے کا صدر مقام ہے جو تمام عرب پر اپنے مذہبی اقتدار، اپنی دولت و تجارت اور اپنے سیاسی و بدیبے کی وجہ سے چھلایا ہوا ہے۔ عین اس حالت میں جب کہ یہ لوگ اپنے انہائی عروج پر ہیں اس بستی کا ایک آدمی الٹھتا ہے اور علی الاعلان کہتا ہے کہ جس مذہب کے تم پیشووا ہو وہ سراسر گمراہی ہے، جس نظامِ تمدن کے تم سردار ہو وہ اپنی جڑ تک گلا اور سڑا ہوا نظام ہے، خدا کا عذاب تم پر ٹوٹ پڑنے کے لیے تلاکھڑا ہے اور تمہارے لیے اس سے بچنے کی کوئی صورت اس کے سوانحیں ہے کہ اس مذہب حق اور اس نظام صالح کو قبول کر لو جو میں خدا کی طرف سے تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ اس شخص کے ساتھ اس کی پاک سیرت اور اس کی معقول باتوں کے سوا کوئی ایسی غیر معمولی چیزیں ہیں ہے جس سے عام لوگ اسے مامور من اللہ سمجھیں۔ اور گرد و پیش کے حالات میں بھی مذہب و اخلاق اور تمدن کی گہری بنیادی خرا یوں کے سوا کوئی ایسی ظاہری علامت نہیں ہے جو نزول عذاب کی نشان وہی کرتی ہو۔ بلکہ اس کے برکس تمام نمایاں علامتیں بیکی ظاہر کر رہی ہیں کہ ان لوگوں پر خدا کا (اور ان کے عقیدے کے مطابق) دیوتاؤں کا بڑا فضل ہے اور جو کچھ وہ کر رہے ہیں ٹھیک ہی کر رہے ہیں۔ ایسے حالات میں یہ بات کہنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے، اور اس کے سوا کچھ ہو بھی نہیں سکتا، کہ چند نہایت صحیح الدمامغ اور حقیقت رس لوگوں کے سوابتی کے سب لوگ اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ کوئی ظلم و ستم سے اس کو دبانا چاہتا ہے۔ کوئی جھوٹ الزامات اور او پچھے اعتراضات سے اس کی ہوا اکھاڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ کوئی متعصبانہ بے رخی سے اس کی بہت شکنی کرتا ہے اور کوئی مذاق اڑا کر، آوازے اور پچھتیاں کس کر، اور جھٹھنے لگا کر اس کی باتوں کو ہوا میں اڑا دینا چاہتا ہے۔ یہ استقبال جو کئی سال تک اس شخص کی دعوت کا ہوتا رہتا ہے، جیسا کچھ دل شکن اور مایوس کن ہو سکتا ہے، ظاہر ہے۔ بس یہی صورت حال ہے جس میں اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کی بہت بندھانے کے لیے تلقین فرماتا ہے کہ اچھے حالات میں پھول جانا اور بے حالات میں مایوس ہو جانا پچھوڑے لوگوں کا کام ہے۔ ہماری زنگاہ میں قیمتی انسان وہ ہے جو نیک ہو اور نیکی کے راستے پر صبر و ثبات اور پامردی کے ساتھ چلنے والا ہو۔ لہذا جس تعصباً سے، جس بے رخی سے، جس تصحیح و استہرا سے اور جن جاہلانہ اعتراضات سے تمہارا مقابلہ کیا جا رہا ہے ان کی وجہ سے تمہارے پائے ثبات میں ذرا الغرض نہ آنے پائے۔ جو صداقت تم پر بذریعہ وحی مکشف کی لگی ہے اس کے اظہار و اعلان میں اور اس کی طرف دعوت دینے میں تمہیں قطعاً کوئی باک نہ ہو۔ تمہارے دل میں اس خیال کا کبھی گزرتک نہ ہو کہ فلاں بات کیسے کہوں جب کہ لوگ سنتے ہی اس کا مذاق اڑانے لگتے ہیں، اور فلاں حقیقت کا اظہار کیسے کروں جب کہ کوئی اس کے سنتے تک کاروادار نہیں ہے۔ کوئی مانے یا نہ مانے، تم جسے حق پاتے ہو اسے بے کم و کاست اور بے خوف بیان کیے جاؤ، آگے سب معاملات اللہ کے حوالے ہیں۔

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ قُلْ فَإِنَّا بِعَشْرِ سَوَّى مِثْلِهِ مُفْتَرِيٌ
وَادْعُوا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَدِيقِينَ ۚ ۱۳
فَإِنَّمَا يُسْتَجِيبُ لِكُمْ فَاعْلَمُوا أَنَّمَا أُنْزَلَ بِعِلْمِ اللَّهِ وَأَنَّ لَهُ
إِلَهٌ إِلَّا هُوَ ۖ فَهَلْ أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ۚ ۱۴ مَنْ كَانَ يُرِيدُ
الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَرِزْنَتَهَا نُوقِّي إِلَيْهِمْ أَعْهَالَهُمْ فِيهَا وَهُمْ فِيهَا

کیا یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے یہ کتاب خود گھٹلی ہے؟ کہو، ”اچھا یہ بات ہے تو اس جیسی گھٹلی ہوئی وہ سورتیں تم بنالا اور اللہ کے سوا اور جو جو (تمہارے معبدوں) ہیں ان کو مدد کے لیے بلا سکتے ہو تو بلا لوگر تم (انھیں معبدوں سمجھنے میں) پچھے ہو۔ اب اگر وہ (تمہارے معبدوں) تمہاری مدد نہیں پہنچتے تو جان لو کہ یہ اللہ کے علم سے نازل ہوئی ہے اور یہ کہ اللہ کے سوا کوئی حقیقی معبدوں نہیں ہے۔ پھر کیا تم (اس امر حلق کے آگے) سرتلیم ختم کرتے ہو؟“ [۱۳] جو لوگ بس اس دنیا کی زندگی اور اس کی خوش نمائیوں کے طالب ہوتے ہیں [۱۴] ان کی کارگزاری کا سارا پھل ہم یہیں ان کو دے دیتے ہیں اور اس میں ان کے

[۱۴] یہاں ایک ہی دلیل سے قرآن کے کلام الہی ہونے کا شوہوت بھی دیا گیا ہے اور تو حیدر کا ثبوت بھی۔ استدلال کا خلاصہ یہ ہے کہ:
(۱) اگر تمہارے نزدیک یہ انسانی کلام ہے تو انسان کو ایسے کلام پر قادر ہونا چاہیے، لہذا تمہارا یہ دعویٰ کہ میں نے اسے خود تصنیف کیا ہے صرف اسی صورت میں صحیح ہو سکتا ہے کہ تم ایسی ایک کتاب تصنیف کر کے دکھاؤ۔ لیکن اگر میرے بار بار چلنچ دینے پر بھی تم سب مل کر اس کی نظر پیش نہیں کر سکتے تو میرا یہ دعویٰ صحیح ہے کہ میں اس کتاب کا مصنف نہیں ہوں بلکہ یہ اللہ کے علم سے نازل ہوئی ہے۔

(۲) پھر جب کہ اس کتاب میں تمہارے معبدوں کی بھی کھلمن کھلما مختلفت کی گئی ہے اور صاف صاف کہا گیا ہے کہ ان کی عبادت چھوڑ دیکھنا کوئی حصہ نہیں ہے، تو ضرور ہے کہ تمہارے معبدوں کو بھی (اگر فی الواقع ان میں کوئی طاقت ہے) میرے دعوے کو جھوٹا ثابت کرنے اور اس کتاب کی نظر پیش کرنے میں تمہاری مدد کرنی چاہیے۔ لیکن اگر وہ اس فیصلے کی گھٹلی میں بھی تمہاری مدد نہیں کرتے اور تمہارے اندر کوئی ایسی طاقت نہیں پھونکتے کہ تم اس کتاب کی نظر پیش کر سکو، تو اس سے صاف ثابت ہو جاتا ہے کہ تم نے خواہ خواہ ان کو معبدوں بنا کر کھا ہے، ورنہ درحقیقت ان کے اندر کوئی قدرت اور کوئی شایبہ اور ہیئت نہیں ہے جس کی بناء پر وہ معبدوں ہونے کے مستحق ہوں۔

اس آیت سے ضمناً یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ یہ سورۃ ترتیب نزوں کے اعتبار سے سورۃ یونس سے پہلے کی ہے۔ یہاں وہ سورتیں بنائ کر لانے کا چلنچ دیا گیا ہے اور جب وہ اس کا جواب نہ دے سکے تو پھر سورۃ یونس میں کہا گیا کہ اچھا ایک ہی سورۃ اس کے مانند تصنیف کر لاؤ۔ (یونس، آیت ۳۸)

[۱۵] اس سلسلہ کلام میں یہ بات اس مناسبت سے فرمائی گئی ہے کہ قرآن کی دعوت کو جس قسم کے لوگ اُس زمانہ میں روکر رہے تھے اور آج بھی روکر رہے ہیں وہ زیادہ تر وہی تھے اور ہیں جن کے دل و دماغ پر دنیا پرستی چھائی ہوئی ہے۔ خدا کے پیغام کو روکنے کے لیے جو دلیل بازیاں وہ کرتے ہیں وہ سب تو بعد کی چیزیں ہیں۔ پہلی چیز جو اس انکار کا اصل سبب ہے وہ ان کے نفس کا یہ فیصلہ ہے کہ دنیا اور اس کے

**لَا يُبْخِسُونَ ۖ۝ اُولَئِكَ الَّذِينَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْأُخْرَىٰ إِلَّا التَّارِظُ
وَحِيطَ مَا صَنَعُوا فِيهَا وَبَطْلٌ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۚ۝ اَفَمَنْ
كَانَ عَلَىٰ بَيْنَكُلَّيْ قِنْ رَّبِّهِ وَيَتَلوُهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِنْ قَبْلِهِ**

ساتھ کوئی کمی نہیں کی جاتی۔ مگر آخرت میں ایسے لوگوں کے لیے آگ کے سوا کچھ نہیں ہے۔^[۱۶] (وہاں معلوم ہو جائے گا کہ) جو کچھ انہوں نے دنیا میں بنایا وہ سب ملیا میٹ ہو گیا اور اب ان کا سارا کیا دھر اخض باطل ہے۔ پھر بھلا وہ شخص جو اپنے رب کی طرف سے ایک صاف شہادت رکھتا تھا،^[۱۷] اس کے بعد ایک گواہ بھی پروردگار کی طرف سے (اس شہادت کی تائید میں) آگیا،^[۱۸]

مادی فائدوں سے بالاتر کوئی شے قبل قدر نہیں ہے، اور یہ کہ ان فائدوں سے مقتمع ہونے کے لیے ان کو پوری آزادی حاصل رہنی چاہیے۔
[۱۶] یعنی جس کے پیش نظر محض دنیا اور اس کا فائدہ ہو، وہ اپنی دنیا بنانے کی جیسی کوشش یہاں کرے گا ویسا ہی اس کا پھل اسے یہاں مل جائے گا۔ لیکن جب کہ آخرت اس کے پیش نظر نہیں ہے اور اس کے لیے اس نے کوئی کوشش بھی نہیں کی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کی دنیا طلب مسامی کی بار آوری کا سلسہ آخرت تک دراز ہو۔ وہاں پھل پانے کا مکان تو صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب کہ دنیا میں آدمی کی سمجھی ان کاموں کے لیے ہو جو آخرت میں بھی نافع ہوں۔ مثال کے طور پر ایک شخص چاہتا ہے کہ ایک شاندار مکان اسے رہنے کے لیے ملے اور وہ اس کے لیے ان مدد ایک کوئی مل میں لاتا ہے جن سے یہاں مکان بنانا کرتے ہیں تو ضرور ایک عالی شان محل بن کر تیار ہو جائے گا اور اس کی کوئی ایسٹ بھی محض اس بنا پر جنمے سے انکار نہ کرے گی کہ ایک کافر اسے جمانے کی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن اس شخص کو اپنائی محل اور اس کا سارا سروسامان موت کی آخری بیکی کے ساتھ ہی اس دنیا میں چھوڑ دینا پڑے گا اور اس کی کوئی چیز بھی وہ اپنے ساتھ دوسرے عالم میں نہ لے جاسکے گا۔ اگر اس نے آخرت میں محل تعمیر کرنے کے لیے کچھ نہیں کیا ہے تو کوئی معقول وجہ نہیں کہ اس کا محل وہاں اس کے ساتھ منتقل ہو۔ وہاں کوئی محل وہ پاسکتا ہے جب کہ دنیا میں اس کی سمجھی ان کاموں میں ہو جن سے قانون الٰہی کے مطابق آخرت کا محل بنتا کرتا ہے۔

اب سوال یہ کیا جاسکتا ہے کہ اس دلیل کا تقاضا تو صرف اتنا ہی ہے کہ وہاں اسے کوئی محل نہ ملے۔ مگر یہ کیا بات ہے کہ محل کے بجائے وہاں اسے آگ ملے گی؟ اس کا جواب یہ ہے (اور یہ قرآن ہی کا جواب ہے جو مختلف موقع پر اس نے دیا ہے) کہ جو شخص آخرت کو نظر انداز کر کے محض دنیا کے لیے کام کرتا ہے وہ لازماً وفطرتا ایسے طریقوں سے کام کرتا ہے جن سے آخرت میں محل کے بجائے آگ کا الاؤ تیار ہوتا ہے۔ (ملاحظہ: سورہ یوسوس، حاشیہ ۱۲)

[۱۷] یعنی جس کو خود اپنے وجود میں اور زمین و آسمان کی ساخت میں اور کائنات کے نظم و نتیجے میں اس امر کی کھلی شہادت مل رہی تھی کہ اس دنیا کا خالق، مالک، پروردگار اور حاکم و فرمادار ایک خدا ہے، اور پھر انہی شہادتوں کو دیکھ کر جس کا دل یہ گواہی بھی پہلے ہی سے دے رہا تھا کہ اس زندگی کے بعد کوئی اور زندگی ضرور ہونی چاہیے جس میں انسان اپنے خدا کو اپنے اعمال کا حساب دے اور اپنے کی جزا اور مزایا پائے۔

[۱۸] یعنی قرآن، جس نے آکر اس فطری و عقلی شہادت کی تائید کی اور اسے بتایا کہ فی الواقع حقیقت وہی ہے جس کا نشان

کِتَبٌ مُّوسَىٰ إِمَامًا وَرَحْمَةً طَّا اُولَئِكَ يُؤْمِنُونَ بِهِ وَمَنْ يَكْفُرُ
بِهِ مِنَ الْأَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهُ ۚ فَلَا تَكُنْ فِي مِرْيَةٍ مِّنْهُ قَ
إِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُونَ ۖ وَمَنْ
أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَى عَلَى اللَّهِ كَذِبًا طَّا اُولَئِكَ يُعْرَضُونَ عَلَى
رَبِّهِمْ وَيَقُولُ الْأَشْهَادُ هُوَ لَا إِلَهَ إِلَّا إِلَّا ذُرْنَيْنَ كَذَبُوا عَلَى رَبِّهِمْ ۚ

اور پہلے موسیٰ کی کتاب رہنماء اور رحمت کے طور پر آئی ہوئی بھی موجود تھی (کیا وہ بھی دنیا پرستوں کی طرح اس سے انکار کر سکتا ہے؟) ایسے لوگ تو اس پر ایمان ہی لا سکیں گے۔ [۱۹] اور انسانی گروہوں میں سے جو کوئی اس کا انکار کرے تو اس کے لیے جس جگہ کا وعدہ ہے وہ دوزخ ہے۔ پس اے پیغمبر، تم اس چیز کی طرف سے کسی شک میں نہ پڑنا، یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے مگر اکثر لوگ نہیں مانتے۔ اور اس شخص سے بڑھ کر خالم اور کون ہو گا جو اللہ پر جھوٹ گھڑے؟ [۲۰] ایسے لوگ اپنے رب کے حضور پیش ہوں گے اور گواہ شہادت دیں گے کہ یہ ہیں وہ لوگ جنہوں نے اپنے رب پر جھوٹ گھڑا تھا۔

آفاق و افس کے آثار میں تو نے پایا ہے۔

[۱۹] سلسلہ کلام کے لحاظ سے اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ دنیوی زندگی کے ظاہری پہلو پر اور اس کی خوش نمائیوں پر فریغتہ ہیں ان کے لیے تو قرآن کی دعوت کو رد کر دینا آسان ہے۔ مگر وہ شخص جو اپنی ہستی میں اور کائنات کے نظام میں پہلے سے توحید و آخرت کی کھلی شہادت پار ہاتھا، پھر قرآن نے آکر تھیک وہی بات کہی جس کی شہادت وہ پہلے سے اپنے اندر بھی پار ہاتھا اور باہر بھی، اور پھر اس کی مزید تائید قرآن سے پہلے آئی ہوئی کتاب آسمانی میں بھی اسے مل گئی، آخروہ کس طرح اتنی زبردست شہادتوں کی طرف سے آنکھیں بند کر کے ان منکرین کا ہم نہ اہو سکتا ہے؟ اس ارشاد سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ نے زوال قرآن سے پہلے ایمان بالغیب کی منزل سے گزر چکے تھے۔ جس طرح سورہ انعام میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق بتایا گیا ہے کہ وہ نبی ہونے سے قبل آثار کائنات کے مشاہدے سے وہ توحید کی معرفت حاصل کر چکے تھے، اسی طرح یہ آیت صاف بتارہی ہے کہ نبی ﷺ نے بھی غور و فکر سے اس حقیقت کو پالیا تھا اور اس کے بعد قرآن نے آکر اس کی نصرت تقدیم تو ویتن کی بلکہ آپ کو حقیقت کا براہ راست علم بھی عطا کر دیا گیا۔

[۲۰] یعنی یہ کہ کہ اللہ کے ساتھ خدائی اور اتحادیت بندگی میں دوسرے بھی شریک ہیں۔ یا یہ کہے کہ خدا کو اپنے بندوں کی ہدایت و ضلالت سے کوئی دچپی نہیں ہے اور اس نے کوئی کتاب اور کوئی نبی ہماری ہدایت کے لیے نہیں بھیجا ہے، بلکہ ہمیں آزاد چھوڑ دیا ہے کہ جو ڈھنگ چاہیں اپنی زندگی کے لیے اختیار کر لیں۔ یا یہ کہے کہ خدا نے ہمیں یونہی کھیل کے طور پر پیدا کیا اور یونہی ہم کو ختم کر دے گا، کوئی جواب دہی ہمیں اس کے سامنے نہیں کرنی ہے اور کوئی جزا اور سزا نہیں ہونی ہے۔

اَلَا لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الظَّالِمِينَ ﴿٨﴾ اَلَّذِينَ يَصْدُونَ عَنْ
 سَبِيلِ اللَّهِ وَيَبْعُونَهَا عِوْجَاطَ وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ كُفَّارُونَ ﴿٩﴾
 اُولَئِكَ لَمْ يَكُونُوا مُعْجِزِينَ فِي الْأَرْضِ وَمَا كَانَ لَهُمْ
 مِنْ دُوْنِ اللَّهِ مِنْ اُولَيَاءِ مُرْضِعَ لَهُمُ الْعَذَابُ مَا كَانُوا
 يَسْتَطِيعُونَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوا يُبْصِرُونَ ﴿۱۰﴾ اُولَئِكَ الَّذِينَ
 خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَقْتَرُونَ ﴿۱۱﴾ لَاجْرَمُ
 أَنَّهُمْ فِي الْآخِرَةِ هُمُ الْأَخْسَرُونَ ﴿۱۲﴾ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا

سنو! خدا کی لعنت ہے طالموں پر [۲۱] — ان طالموں پر [۲۲] جو خدا کے راستے سے لوگوں کو روکتے ہیں، اس کے راستے کو ٹیڑھا کرنا چاہتے ہیں [۲۳] اور آخرت کا انکار کرتے ہیں۔ وہ زمین میں [۲۴] اللہ کو بے بس کرنے والے نہ تھے اور نہ اللہ کے مقابلہ میں کوئی ان کا حامی تھا۔ انھیں اب دو ہر اعداً بدبختی میں ڈالا اور وہ سبکتے تھے اور نہ خود ہی انھیں کچھ سوچتا تھا۔ یہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو خود گھاٹے میں ڈالا اور وہ سب کچھ ان سے کھوایا گیا جو انہوں نے گھر رکھا تھا۔ [۲۵] ناگزیر ہے کہ وہی آخرت میں سب سے بڑھ کر گھاٹے میں رہیں۔ رہے وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے اور اپنے

[۲۱] اندازیاں سے صاف ظاہر ہے کہ یہ بات آخرت میں ان کی پیشی کے موقع پر کبھی جائے گی۔

[۲۲] یہ جملہ معترض ہے کہ جن طالموں پر وہاں خدا کی لعنت کا اعلان ہو گا وہ ہی لوگ ہوں گے جو آج دنیا میں یہ حرکات کر رہے ہیں۔

[۲۳] یعنی وہ اس سیدھی را کو جوان کے سامنے پیش کی جا رہی ہے پسند نہیں کرتے اور چاہتے ہیں کہ یہ راہ کچھ ان کی خواہشات نفس اور ان کے جاہلانہ تعصبات اور ان کے اوہماں و تخلیقات کے مطابق ٹیڑھی ہو جائے تو وہ اسے قبول کریں۔

[۲۴] یہ پھر عالم آخرت کا بیان ہے۔

[۲۵] ایک عذاب خود گراہ ہونے کا۔ دوسرا عذاب دوسروں کو گراہ کرنے اور بعد کی نسلوں کے لیے گمراہی کی میراث چھوڑ جانے کا۔ (ملاحظہ، سورہ اعراف، حاشیہ ۳۰)

[۲۶] یعنی وہ سب نظریات پادر ہوا ہو گئے جو انہوں نے خدا اور کائنات اور اپنی ہستی کے متعلق گھر رکھتے تھے، اور وہ سب بھروسے بھی جھوٹے ثابت ہوئے جو انہوں نے اپنے معبودوں اور سفارشیوں اور سرپرستوں پر کر رکھتے تھے، اور وہ قیاسات بھی غلط نکلے جو انہوں نے زندگی بعد موت کے بارے میں قائم کیے تھے۔

الصِّلْحَتِ وَأَخْبَتُو إِلَى رَبِّهِمْ لَاۤ أُولَئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمْ
فِيهَا خَلِدُونَ ۝ مَثَلُ الْفَرِيقَيْنِ كَالْأَعْنَى وَالْأَصَمِّ وَالْبَصِيرِ ۝
وَالسَّمِيعِ ۝ هُلْ يَسْتَوِينَ مَثَلًا طَآفَلًا تَذَكَّرُونَ ۝ وَلَقَدْ أَرَسْلَنَا
نُوحًا إِلَى قَوْمِهِ زَانِي نَكْرُتَذِيرِ مُسِينٌ ۝ لَاۤ أَنْ لَا تَعْبُدُواۤ
إِلَّا اللَّهُ طَإِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابٌ يَوْمٌ أَلِيمٌ ۝ فَقَالَ الْمُلَكُ
الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَوْمِهِ مَا نَرِيكَ إِلَّا بَشَرًا مِثْلَنَا وَمَا

رب ہی کے ہو کر رہے، تو یقیناً وہ جنتی لوگ ہیں اور جنت میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ [۲۷] ان دونوں فریقوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک آدمی تو ہواندھا بہرا اور دوسرا ہو دیکھنے اور سننے والا، کیا یہ دونوں یکساں ہو سکتے ہیں؟ [۲۸] کیا تم (اس مثال سے) کوئی سبق نہیں لیتے؟

(اور ایسے ہی حالات تھے جب) ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا تھا۔ (اس نے کہا) ”میں تم لوگوں کو صاف صاف خبردار کرتا ہوں کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو ورنہ مجھے اندیشہ ہے کہ تم پر ایک روز دردناک عذاب آئے گا۔“ [۲۹] جواب میں اس کی قوم کے سردار، جنہوں نے اس کی بات ماننے سے انکار کیا تھا، بولے ”ہماری نظر میں تو تم اس کے سوا کچھ نہیں ہو کہ میں ایک انسان ہو ہم جیسے۔“ [۳۰]

[۲۷] یہاں عالم آخرت کا بیان ختم ہوا۔

[۲۸] یعنی کیا ان دونوں کا طرز عمل اور آخوندگی دونوں کا انجام یکساں ہو سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ شخص نہ خود استدیکھتا ہے اور نہ کسی ایسے شخص کی بات ہی سنتا ہے جو اسے راستہ بتا رہا ہو وہ ضرور کہیں ٹھوکر کھائے گا اور کہیں کسی سخت حادث سے دوچار ہو گا۔ بخلاف اس کے جو شخص خود بھی راستہ دیکھ رہا ہو اور کسی واقف را کی بدایات سے بھی فائدہ اٹھاتا ہو وہ ضرور اپنی منزل پر پہ سلامت پہنچ جائے گا۔ میں اسی ہی فرق ان لوگوں کے درمیان بھی ہے جن میں سے ایک اپنی آنکھوں سے بھی کائنات میں حقیقت کی نشانیوں کا مشاہدہ کرتا ہے اور خدا کے بھیجے ہوئے رہنماؤں کی بات بھی سنتا ہے، اور دوسرا نہ خود ہی کی آنکھیں کھلی رکھتا ہے کہ خدا کی نشانیاں اسے نظر آئیں اور یہ غیرہ بھروسی کی بات ہی ان کر دیتا ہے۔ کیونکہ ممکن ہے کہ زندگی میں ان دونوں کا طرز عمل یکساں ہو؟ اور پھر کیا وجہ ہے کہ آخوندگی کے انجام میں فرق نہ ہو؟

[۲۹] مناسب ہے کہ اس موقع پر سورہ اعراف، رکوع ۸ کے حوالی پیش نظر کھے جائیں۔

[۳۰] یہ ہی بات ہے جو اس سورہ کے آغاز میں محمد ﷺ کی زبان سے ادا ہوئی ہے۔

[۳۱] وہی جملانہ اعتراض جو کہ کے لوگ محمد ﷺ کے مقابلہ میں پیش کرتے تھے کہ جو شخص بھاری ہی طرح کا ایک معمولی انسان ہے، کھاتا پیتا ہے، پدر جرتا ہے، سوتا اور جا گتا ہے، بال بچ رکھتا ہے، آخر ہم کیسے مان لیں کہ وہ خدا کی طرف سے پیغمبر مقرر ہو کر آیا ہے۔

نَرِبَكَ اتَّبَعَكَ إِلَّا الَّذِينَ هُمْ أَرَادُلَنَا بَادِيَ الرَّأْيِ وَمَا
نَرِبَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ بَلْ نَظْنَكُمْ كَذِبِينَ ۚ ۷۵ قَالَ يَقُومُ
أَرَءَيْتُمْ إِنْ كُنْتُ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِنْ سَارِيٍّ وَأَتَنِي رَحْمَةً مِنْ
عِنْدِكُمْ فَعُيْدِيْتُ عَلَيْكُمْ أَنْلَزْمُكُمُوهَا وَأَنْتُمْ لَهَا كُرْهُونَ ۷۶
وَيَقُومُ لَا أَسْلَكُمْ عَلَيْهِ مَالًا طَإِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللَّهِ وَمَا آنَا

اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہماری قوم میں سے بس ان لوگوں نے جو ہمارے ہاں ارادل تھے بے سوچے سمجھے تمہاری پیروی اختیار کر لی ہے۔ [۳۲] اور ہم کوئی چیز بھی ایسی نہیں پاتے جس میں تم لوگ ہم سے کچھ بڑھے ہوئے ہوئے ہو، [۳۳] بلکہ ہم تو تمہیں جھوٹا سمجھتے ہیں۔ اس نے کہا ”اے برادر ان قوم، ذرا سوچو تو سہی کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک کھلی شہادت پر قائم تھا اور پھر اس نے مجھ کو اپنی خاص رحمت سے بھی نواز دیا“ [۳۴] مگر وہ تم کو نظر نہ آئی تو آخر ہمارے پاس کیا ذریعہ ہے کہ تم ماننا نہ چاہو اور ہم زبردستی اس کو تمہارے سرچیک دیں؟ اور اے برادر ان قوم، میں اس کام پر تم سے کوئی مال نہیں مان لتا، [۳۵] میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے۔ اور میں ان لوگوں کو

[۳۲] یہ بھی وہی بات ہے جو کہ کے بڑے لوگ اور اونچے طبقے والے محمد ﷺ کے متعلق کہتے تھے کہ ان کے ساتھ ہے کون؟ یا تو چند سرپھرے لڑکے ہیں جنہیں دنیا کا کچھ تجھ بھی نہیں، یا کچھ غلام اور ادنی طبقہ کے عوام ہیں جو عقل سے کورے اور ضعیف الاعتقاد ہوتے ہیں۔ (ملاحظہ ہوسوہ انعام، حواشی ۳۲۳ تا ۳۳۳ ص ۳۰۰، سورہ یوں، حاشیہ ۲۸)

[۳۳] یعنی یہ جو تم کہتے ہو کہ ہم پر خدا کا فضل ہے اور اس کی رحمت ہے اور وہ لوگ خدا کے غصب میں مبتلا ہیں جنہوں نے ہمارا راستہ اختیار نہیں کیا ہے، تو اس کی کوئی علامت ہمیں نظر نہیں آتی۔ فضل اگر ہے تو ہم پر ہے کہ مال و دولت اور خدم و خشم رکھتے ہیں اور ایک دنیا ہماری حسروواری مان رہی ہے۔ تم ٹھ پونجے لوگ آخ رس پیڑ میں ہم سے بڑھے ہوئے ہو کہ تمہیں خدا کا چیتا سمجھا جائے۔

[۳۴] یہ وہی بات ہے جو ابھی پچھلے روئے میں محمد ﷺ سے کہلوائی جا چکی ہے کہ پہلے میں خود آفاق و افس میں خدا کی نشانیاں دیکھ کر توجید کی حقیقت تک پہنچ گا تھا، پھر خدا نے اپنی رحمت (وہی) سے مجھ نواز اور ان حقیقتوں کا براہ راست علم مجھے بخش دیا جن پر میرا دل پہلے سے گواہی دے رہا تھا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تمام پتغیریوں سے قبل اپنے غور و فکر سے ایمان بالغیب حاصل کر چکے ہوتے تھے، پھر اللہ تعالیٰ ان کو منصب نبوت عطا کرتے وقت ایمان پا شہادۃ عطا کرتا تھا۔

[۳۵] یعنی میں ایک بے غرض ناصح ہوں۔ اپنے کسی فائدے کے لیے نہیں بلکہ تمہارے ہی بھلے کے لیے یہ ساری مشقیں اور تکلیفیں بزادشت کر رہا ہوں۔ تم کسی ایسے ذاتی مفاد کی نشان دہی نہیں کر سکتے جو اس امرحق کی دعوت دینے میں اور اس کے لیے جان توڑ مختیں کرنے اور مصیتیں جھیلنے میں میرے پیش نظر ہو۔ (ملاحظہ ہوسوہ انعام حاشیہ، ۲۰۔ یہ ایمان بالغیب حاصل کر چکے ہوتے ہیں۔ حاشیہ ۲۱۔ الشوری، حاشیہ ۱۷)

بِطَارِدِ الَّذِينَ أَمْنَوْا إِنَّهُمْ مُلْقُوا رَبِّهِمْ وَلِكُنَّ أَرْكُمْ قَوْمًا
تَجْهَلُونَ ۝ وَيَقُولُ مَنْ يَنْصُرُنِي مِنَ اللَّهِ إِنْ طَرَدْتَهُمْ أَفَلَا
تَدْكَرُونَ ۝ وَلَا أَقُولُ لَكُمْ عِنْدِي خَزَائِنُ اللَّهِ وَلَا أَعْلَمُ
الْغَيْبَ وَلَا أَقُولُ إِنِّي مَلِكٌ وَلَا أَقُولُ لِلَّذِينَ تَزَدَّرِي أَعْيُنُكُمْ
نَنْ يُؤْتِيْهُمُ اللَّهُ خَيْرًا أَلَّهُ أَعْلَمُ بِمَا فِي أَنْفُسِهِمْ هَلْ إِنِّي إِذَا
لَمْ يَمِنَ الظَّلَمِينَ ۝ قَاتُلُوا يُنْوِحُ قَدْ جَدَ لَنَا فَأَكْثَرُتْ جَدَانَا

دھکے دینے سے بھی رہا جنہوں نے میری بات مانی ہے، وہ آپ ہی اپنے رب کے حضور جانے والے ہیں۔ [۳۱] مگر میں دیکھتا ہوں کہ تم لوگ جہالت برت رہے ہو۔ اور اے قوم، اگر میں ان لوگوں کو دھنکاردوں تو خدا کی پکڑ سے کون مجھے بچانے آئے گا؟ تم لوگوں کی سمجھ میں کیا اتنی بات بھی نہیں آتی؟ اور میں تم سے نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں، نہ یہ کہتا ہوں کہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں، نہ یہ میرا دعویٰ ہے کہ میں فرشتہ ہوں۔ [۳۲] اور یہ بھی میں نہیں کہہ سکتا کہ جن لوگوں کو تمہاری آنکھیں خمارت سے دیکھتی ہیں انھیں اللہ نے کوئی بھلانی نہیں دی۔ ان کے نفس کا حال اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ اگر میں ایسا کہوں تو ظالم ہوں گا۔“

آخر کاران لوگوں نے کہا کہ ”اے نوح، تم نے ہم سے جھگڑا کیا اور بہت کر لیا۔

[۳۲] یعنی ان کی قدر و قیمت جو کچھ بھی ہے وہ ان کے رب کو معلوم ہے اور اسی کے حضور جا کروہ کلے گی۔ اگر یہ قیمت جو ہر ہیں تو میرے اور تمہارے پھینک دینے سے پھر نہ ہو جائیں گے، اور اگر یہ قیمت پھر ہیں تو ان کے مالک کو اختیار ہے کہ انہیں جہاں چاہے پھینکے۔

[۳۳] یہ اس بات کا جواب ہے جو مخالفین نے کہی تھی کہ ہمیں تو تم بس اپنے ہی جیسے ایک انسان نظر آتے ہو۔ اس پر حضرت نوح علیہ السلام فرماتے ہیں کہ واقعی میں ایک انسان ہی ہوں، میں نے انسان کے سوا کچھ اور ہونے کا دعویٰ کہ کیا تھا کہ تم مجھ پر یہ اعتراض کرتے ہو۔ میرا دعویٰ جو کچھ ہے وہ تو صرف یہ ہے کہ خدا نے مجھے علم و عمل کا سیدھا راستہ دھایا ہے۔ اس کی آزمائش تم جس طرح چاہو کرلو۔ مگر اس دعوے کی آزمائش کا آخر یہ کون ساطر یقہ ہے کہ کبھی تم مجھ سے غیب کی خبریں پوچھتے ہو، اور کبھی ایسے عجیب مطالبے کرتے ہو کہ گویا خدا کے خزانوں کی ساری کنجیاں میرے پاس ہیں، اور کبھی اس بات پر اعتراض کرتے ہو کہ میں انسانوں کی طرح کھاتا پیتا اور چلتا پھرتا ہوں، گویا میں نے فرشتہ ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ جس آدمی نے عقائد، اخلاق اور تہذیب میں صحیح رہبیری کا دعویٰ کیا ہے اس سے ان چیزوں کے متعلق جو چاہو پوچھو، مگر تم عجیب لوگ ہو جو اس سے پوچھتے ہو کہ فلاں شخص کی بھنس کشو جتنے گی یا پڑیا۔ گویا انسانی زندگی کے لیے صحیح اصول اخلاق و تہذیب تاذے کا کوئی تعلق بھنس کے حمل سے بھی ہے! (ملاحظہ: ہو سورة انعام، حاشیہ ۳۲، ۳۱)

فَاتِنَا إِيمَانًا عِدْنَا إِنْ كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ۝ قَالَ إِنَّمَا
يَا تَبَّاكُمْ بِهِ اللَّهُ إِنْ شَاءَ وَمَا أَنْتُمْ بِسُعْجِزِينَ ۝ وَلَا يَنْفَعُكُمْ
نُصْحِي إِنْ أَرَدْتُ أَنْ أَنْصَحَ لَكُمْ إِنْ كَانَ اللَّهُ يُرِيدُ أَنْ
يَعْوِيَكُمْ هُوَ رَبُّكُمْ فَوَاللَّيْهِ تُرْجَعُونَ ۝ أَمْرَيَقُولُونَ افْتَرِيه
۝ قُلْ إِنْ افْتَرَيْتُهُ فَعَلَىٰ إِجْرَاهِيٍّ وَأَنَا بِرِّيٍّ إِمَّا تُجْرِمُونَ ۝

اب تو بس وہ عذاب لے آؤ جس کی تم ہمیں دھمکی دیتے ہوا اگر سچے ہو۔ ”نوخ نے جواب دیا“ وہ تو اللہ ہی لائے گا، اگر چاہے گا، اور تم اتنا بل بوتا نہیں رکھتے کہ اسے روک دو۔ اب اگر میں تمہاری کچھ خیر خواہی کرنا بھی چاہوں تو میری خیر خواہی تمہیں کوئی فائدہ نہیں دے سکتی جب کہ اللہ ہی نے تمہیں بھٹکا دینے کا ارادہ کر لیا ہو، [۳۸] وہی تمہارا رب ہے اور اسی کی طرف تمہیں پلانا ہے۔ ”اے بنی، کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص نے یہ سب کچھ خود گھڑلیا ہے؟ ان سے کہو“ اگر میں نے یہ خود گھڑا ہے تو مجھ پر اپنے جرم کی ذمہ داری ہے، اور جو جرم تم کر رہے ہو اس کی ذمہ داری سے میں بری ہوں۔“ [۳۹]

[۳۸] یعنی اگر اللہ نے تمہاری بہت دھرمی، شرپندی اور خیر سے بے رغبتی دیکھ کر یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ تمہیں راست روی کی توفیق نہ دے اور جن را ہوں میں تم خود بھٹکانا چاہتے ہو انہی میں تم کو بھٹکا دے تو اب تمہاری بھلائی کے لیے میری کوئی کوشش کا گرنہیں ہو سکتی۔

[۳۹] انداز کلام سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بنی علیت اللہ کی زبان سے حضرت نوح کا یہ قصہ سنتے ہوئے مخالفین نے اعتراض کیا ہوا کہ محمدؐ یہ قصہ بنانا کراس لیے پیش کرتا ہے کہ انہیں ہم پر چسپا کرے۔ جو چوتیں وہ ہم پر براہ راست نہیں کرنا چاہتا ان کے لیے ایک قصہ گھڑتا ہے اور اس طرح ”در حدیث دیگر اس“ کے انداز میں ہم پر چوٹ کرتا ہے۔ لہذا سلسلہ کلام توڑ کران کے اعتراض کا جواب اس فقرے میں دیا گیا۔

واقعہ یہ ہے کہ گھٹیا قسم کے لوگوں کا ذہن ہمیشہ بات کے برے پہلو کی طرف جایا کرتا ہے اور اچھائی سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی کہ بات کے اچھے پہلو پر ان کی نظر جاسکے۔ ایک شخص نے اگر کوئی حکمت کی بات کہی ہے یا وہ تمہیں کوئی مفید سبق دے رہا ہے یا تمہاری کسی غلطی پر تم کو متذکر رہا ہے تو اس سے فائدہ اٹھاؤ اور اپنی اصلاح کرو۔ مگر گھٹیا آدمی ہمیشہ اس میں برائی کا کوئی ایسا پبلاؤ تلاش کرے گا جس سے حکمت اور نصیحت پر پانی پھیر دے گا اور نہ صرف خود اپنی برائی پر قائم رہے بلکہ قائل کے ذمے بھی اٹی کچھ برائی لگادے۔ بہتر سے بہتر نصیحت بھی ضائع کی جاسکتی ہے اگر سننے والا سے خیر خواہی کے بجائے ”چوٹ“ کے معنی میں لے لے اور اس کا ذہن اپنی غلطی کے احساس و ادراک کے بجائے برامانے کی طرف چل پڑے۔ پھر اس قسم کے لوگ ہمیشہ اپنی فکر کی بنا ایک بنیادی بدگمانی پر رکھتے ہیں۔ جس بات کے حقیقت واقعی ہونے اور ایک بناؤٹی و استان ہونے کا یکساں امکان ہو، مگر وہ ٹھیک ٹھیک تمہارے حال پر چسپا ہو رہی ہو اور اس میں تمہاری کسی غلطی کی نشان دہی ہوتی ہو، تو تم ایک داش مند آدمی ہو گے، اگر اسے ایک واقعی حقیقت سمجھ کر اس کے سبق آموز پہلو سے فائدہ اٹھاؤ گے، اور محض ایک بدگمان و کچھ نظر آدمی ہو گے اگر کسی ثبوت کے بغیر یہ الزام لگادو گے کہ قائل نے محض ہم پر چسپا کرنے کے لیے یہ قصہ تلفیف کر لیا ہے۔ اسی بناؤٹی فرمایا کہ اگر یہ داستان میں نے گھڑی ہے تو اپنے جرم کا میں ذمہ دار ہوں، لیکن جس جرم کا تم ارتکاب کر رہے ہو وہ تو اپنی جگہ قائم ہے اور اس کی ذمہ داری میں تم ہی پکڑے جاؤ گے نہ کہ میں۔

وَأُوْحَىٰ إِلَىٰ نُوْجَ أَنَّهُ لَنْ يُؤْمِنَ مِنْ قَوْمَكَ إِلَّا مَنْ قَدْ أَمَنَ
 فَلَا تَبْتَدِّسْ بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ﴿۳۴﴾ وَاصْنَعُ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا
 وَوَحْيَنَا وَلَا تُخَاطِبْنِي فِي الَّذِينَ ظَلَمُوا إِنَّهُمْ مُغْرِقُونَ ﴿۳۵﴾
 وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ قَفْ وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَأَ مِنْ قَوْمِهِ سَخْرُوا مِنْهُ
 قَالَ إِنَّ تَسْخِرُوا مِنِّي فَإِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخِرُونَ ﴿۳۶﴾ فَسَوْفَ
 تَعْلَمُونَ لَا مَنْ يَأْتِيْهِ عَذَابٌ يُخْزِيْهُ وَيَحْلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ

نوح پر وحی کی گئی کہ تمہاری قوم میں سے جو لوگ ایمان لا چکے، اب کوئی مانے والا نہیں ہے۔ ان کے کرو تو پر غم کھانا چھوڑ دو اور ہماری نگرانی میں ہماری وحی کے مطابق ایک کشتی بنانی شروع کر دو۔ اور دیکھو، جن لوگوں نے ظلم کیا ہے ان کے حق میں مجھ سے کوئی سفارش نہ کرنا۔ یہ سارے کے سارے اب ڈوبنے والے ہیں [۲۰]۔ نوح کشتی بنارہاتھا اور اس کی قوم کے سرداروں میں سے جو کوئی اس کے پاس سے گزرتا تھا وہ اس کا مذاق اڑاتا تھا۔ اس نے کہا ”اگر تم ہم پر بنتے ہو تو ہم بھی تم پر بنس رہے ہیں، عنقریب تمہیں خود معلوم ہو جائے گا کہ کس پر وہ عذاب آتا ہے جو اسے رسوا کر دے گا اور کس پر وہ بلاٹ پڑتی ہے جوٹا لے نہ ٹلے گی۔“ [۲۱]

[۲۰] اس سے معلوم ہوا کہ جب نبی کا پیغام کسی قوم کو پہنچ جائے تو اسے صرف اس وقت تک مہلت ملتی ہے جب تک اس میں کچھ بھلے آدمیوں کے نکل آنے کا امکان باقی ہو۔ مگر جب اس کے صالح اجزا سب نکل چکتے ہیں اور وہ صرف فاسد عناصر ہی کا مجموعہ رہ جاتی ہے تو اللہ اس قوم کو پھر کوئی مہلت نہیں دیتا اور اس کی رحمت کا تقاضا ہی کہ سڑے ہوئے بچلوں کے اس ٹوکرے کو دور پھیک دیا جائے تاکہ وہ اپنے بچلوں کو بھی خراب نہ کر دے۔ پھر اس پر حرم کھانا ساری دنیا کے ساتھ اور آنے والی انسانی نسلوں کے ساتھ بے رحمی ہے۔

[۲۱] یہ ایک عجیب معاملہ ہے جس پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان دنیا کے ظاہر سے کس قدر دھوکا کھاتا ہے۔ جب نوح علیہ السلام دریا سے بہت دو خشکی پر اپنا جہاز بنارہے ہوں گے تو فی الواقع لوگوں کو یہ ایک نہایت منحک خیز فعل محسوس ہوتا ہو گا اور وہ بنس بن سکتے ہوں گے کہ بڑے میاں کی دیوانگی آخر کو یہاں تک پہنچی کہ اب آپ خشکی میں جہاز چلا کیں گے۔ اس وقت کسی کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہ آ سکتی ہو گی کہ چند روز بعد واقعی یہاں جہاز چلے گا۔ وہ اس فعل کو حضرت نوح علیہ السلام کی خرابی دماغ کا ایک صریح ثبوت قرار دیتے ہوں گے اور ایک ایک سے کہتے ہوں گے کہ اگر پہلے تمہیں اس شخص کے پاگل پن میں کچھ شبہ تھا تو اواب اپنی آنکھوں سے دیکھ لو کیا حرکت کر رہا ہے۔ لیکن جو شخص حقیقت کا علم رکھتا تھا اور جسے معلوم تھا کہ کل یہاں جہاز کی ضرورت پیش آنے والی ہے، اسے ان لوگوں کی جہالت و بے خبری پر اور پھر ان کے احتمانہ طمینان پر اٹھی بُنگی آتی ہو گی اور وہ کہتا ہو گا کہ کس قدر نادان ہیں یہ لوگ کہ شامت ان کے سر بر تلی کھڑی ہے، میں انہیں خدا کر جکا ہوں کو وہ بس آیا جا ہتی ہے اور ان کی آنکھوں کے سامنے اس سے بچنے کی تیاری بھی کر رہا ہوں، مگر یہ مطمئن بیٹھے ہیں اور اسماں مجھے دیوانہ سمجھ رہے ہیں۔ اس معاملہ کو اگر پھیلا کر دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ دنیا

**مُّقِيمٌ ۝ حَتَّىٰ إِذَا جَاءَهُ أَمْرُنَا وَفَارَ النُّورُ لِقُلْنَا احْمِلْ فِيهَا
مِنْ كُلِّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَأَهْلَكَ إِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ
وَمَنْ أَمْنَ طَوَّ وَمَا آمَنَ مَعَهُ إِلَّا قَلِيلٌ ۝ وَقَالَ ارْكِبُوا فِيهَا**

[۳۲] یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آ گیا اور وہ تنور ابل پڑا تو ہم نے کہا "ہر قسم کے جانوروں کا ایک ایک جوڑا کشی میں رکھلو، اپنے گھر والوں کو بھی۔ سوائے ان اشخاص کے جن کی نشان دہی پہلے کی جا چکی ہے۔ اس میں سوار کراو اور ان لوگوں کو بھی بھٹاکو جو ایمان لائے ہیں،" اور تھوڑے ہی لوگ تھے جو نوح کے ساتھ ایمان لائے تھے۔ نوح نے کہا "سوار ہو جاؤ اس میں،

کے ظاہر و محسوس پہلو کے لحاظ سے عقل مندی و بے وقوفی کا جو معیار قائم کیا جاتا ہے وہ اس معیار سے کس قدر مختلف ہوتا ہے جو علم حقیقت کے لحاظ سے قرار پاتا ہے۔ ظاہر میں آدمی جس چیز کو انتہائی دانش مندی سمجھتا ہے وہ حقیقت شناس آدمی کی نگاہ میں انتہائی بے وقوفی ہوتی ہے، اور ظاہر میں کے نزدیک جو چیز بالکل لغو، سراسر دیوانگی اور نرم مفعکہ ہوتی ہے، حقیقت شناس کے لیے وہی کمال دانش، انتہائی سنجیدگی اور عین مقضیائے عقل ہوتی ہے۔

[۳۲] اس کے متعلق مفسرین کے مختلف اقوال ہیں۔ مگر ہمارے نزدیک صحیح وہی ہے جو قرآن کے صریح لفاظ سے سمجھ میں آتا ہے کہ طوفان کی ابتداء ایک خاص تنور سے ہوئی جس کے نیچے سے پانی کا چشمہ پھوٹ پڑا، پھر ایک طرف آسمان سے موسلا دھار بارش شروع ہو گئی اور دوسری طرف زمین میں جگہ جگہ سے چشمے پھوٹنے لگے۔ یہاں صرف تنور کے ابل پڑنے کا ذکر ہے اور آگے چل کر بارش کی طرف بھی اشارہ ہے۔ مگر سورہ قمر میں اس کی تفصیل دی گئی ہے کہ فَتَحْتَنَا أَبْوَابَ السَّمَاءِ بِمَاءٍ مُّنْهَمِرٍ وَ فَجَرَنَا الْأَرْضَ عَيْوَنًا فَالْفَتَقَى الْمَاءُ عَلَىٰ أَمْرٍ قَدْ فِيلَ "ہم نے آسمان کے دروازے کھول دیے جن سے لگاتار بارش برنسے گئی اور زمین کو چھاڑ دیا کہ ہر طرف چشمے ہی چشمے پھوٹ لکے اور یہ دونوں طرح کے پانی اُس کام کو پورا کرنے کے لیے مل گئے جو مقدور کر دیا گیا تھا۔" نیز لفظ تنور پر الف لام داخل کرنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک خاص تنور کو اس کام کی ابتداء کے لیے نام زد فرمادیا تھا جو اشارہ پاتے ہی ٹھیک اپنے وقت پر ابل پڑا اور بعد میں طوفان والے تنور کے حیثیت سے معروف ہو گیا۔

[۳۳] یعنی تمہارے گھر کے جن افراد کے متعلق پہلے بتایا جا چکا ہے کہ وہ کافر ہیں اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کے مستحق نہیں ہیں انہیں کششی میں نہ بھاوا۔ غالباً یہ دو ہی شخص تھے۔ ایک حضرت نوح کا بیٹا جس کے غرق ہونے کا بھی ذکر آتا ہے۔ دوسری حضرت نوح کی بیوی جس کا ذکر سورہ تحریم میں آیا ہے۔ ممکن ہے کہ دوسرے افراد خاندان بھی ہوں مگر قرآن میں ان کا ذکر نہیں ہے۔

[۳۴] اس سے اُن مومنین اور علماء انساب کے نظریہ کی تردید ہوتی ہے جو تمام انسانی نسلوں کا شجرہ نسب حضرت نوح کے تین بیٹوں تک پہنچاتے ہیں۔ دراصل اسرائیلی روایات نے یہ غلط فہمی پھیلادی ہے کہ اس طوفان سے حضرت نوح اور ان کے تین بیٹوں اور ان کی بیویوں کے سوا کوئی نہ بجا تھا (ملاحظہ ہو بائیبل کی کتاب پیدا اش ۱۸:۶، ۷:۷، ۱۹:۹، ۱:۹)۔ لیکن قرآن متعدد مقامات پر اس کی تصریح کرتا ہے کہ حضرت نوح کے خاندان کے سوا اُن کی قوم کی ایک معتد بے تعداد کو بھی اگرچہ تھوڑی تھی، اللہ نے طوفان سے بچا لیا تھا۔ نیز قرآن بعد کی انسانی نسلوں کو صرف نوح کی اولاد نہیں بلکہ ان سب لوگوں کی اولاد فراردیتا ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ رشتی میں بھاٹا دیا تھا، دُرِّيَّةٌ مَنْ حَمَلَنَا مَعَ نُوحٍ ط (بنی اسرائیل: ۳) اور مِنْ دُرِّيَّةٍ أَدْمَ وَمَمَّ حَمَلَنَا مَعَ نُوحٍ ذ (مریم: ۵۸)

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ۝ وَهِيَ
 تَجْرِي بِهِمْ فِي مَوْجٍ كَالْجِبَالِ قَنَادِي نُوحٌ ابْنَهُ وَكَانَ
 فِي مَعْزِلٍ يُبَيْتَى إِذْ كَبَ مَعْنَا وَلَا تَكُونُ مَعَ الْكُفَّارِينَ ۝ قَالَ
 سَاوِيٌّ إِلَى جَبَلٍ يَعْصِمُنِي مِنَ الْهَاءِ قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ
 مِنْ أَمْرِ اللَّهِ إِلَّا مَنْ رَحِمَ وَهَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ
 الْمُغْرِقِينَ ۝ وَقِيلَ يَا رُضُّ أَبْلَغِي مَاءَكَ وَيَسِّئْ أَفْلَغِي وَ
 غَيْضَ الْهَاءِ وَقُضِيَ الْأَمْرُ وَأَسْتَوْتُ عَلَى الْجُودِي ۝ وَقِيلَ
 بُعْدًا لِلنَّقُومِ الظَّلِمِينَ ۝ وَنَادَى نُوحٌ رَبَّهُ فَقَالَ رَبِّ إِنَّ

[۳۵] اللہ ہی کے نام سے ہے اس کا چلنابھی اور اس کا ٹھیکرنا بھی، میرا رب بڑا غفور و رحیم ہے۔

کشتی ان لوگوں کو لیے چلی جا رہی تھی اور ایک ایک موج پہاڑ کی طرح اٹھ رہی تھی۔ نوح کا بیٹا دور فاصلے پر تھا۔ نوح نے پکار کر کہا ”بیٹا! ہمارے ساتھ سوار ہو جا، کافروں کے ساتھ نہ رہ۔“ اس نے پلٹ کر جواب دیا ”میں ابھی ایک پہاڑ پر چڑھا جاتا ہوں جو مجھے پانی سے بچا لے گا۔“ نوح نے کہا ”آج کوئی چیز اللہ کے حکم سے بچانے والی نہیں ہے سوائے اس کے کہ اللہ ہی کسی پر حرم فرمائے۔“ اتنے میں ایک موج دونوں کے درمیان حائل ہو گئی اور وہ بھی ڈوبنے والوں میں شامل ہو گیا۔

حکم ہوا ”اے زمین، اپنا سارا اپانی نگل جا اور اے آسمان، رُک جا۔“ چنانچہ پانی زمین میں پیٹھ گیا، فیصلہ چکا دیا گیا، کشتی جو دی پر نکل گئی [۳۶] اور کہہ دیا گیا کہ دور ہوئی ظالموں کی قوم! نوح نے اپنے رب کو پکارا۔ کہا ”اے رب!

[۳۵] یہ ہے مومن کی اصلی شان۔ وہ عالم اسباب میں ساری تدبیر قانون فطرت کے مطابق اسی طرح اختیار کرتا ہے جس طرح اہل دنیا کرتے ہیں، مگر اس کا بھروسہ ان تدبیروں پر نہیں بلکہ اللہ پر ہوتا ہے اور وہ خوب سمجھتا ہے کہ اس کی کوئی تدبیر نہ تو ٹھیک شروع ہو سکتی ہے، ٹھیک چل سکتی ہے اور نہ آخری مطلوب تک پہنچ سکتی ہے جب تک اللہ کا فضل اور اس کا حرم و کرم شامل حال نہ ہو۔

[۳۶] جو دی پہاڑ گردستان کے علاقے میں جزیرہ، بن عمر کے شمالی مشرقی جانب واقع ہے۔ باشیل میں اس کشتی کے ٹھیکرنے کی جگہ اراراط بتائی گئی ہے جو آرمینیا کے ایک پہاڑ کا نام بھی ہے اور ایک سلسلہ کوہستان کا نام بھی۔ سلسلہ کوہستان کے معنی میں جس کو اراراط کہتے ہیں وہ آرمینیا کی سطح مرتفع سے شروع ہو کر جنوب میں کردستان تک چلتا ہے اور جبل الجودی اسی سلسلے کا ایک پہاڑ ہے جو آج بھی جو دی ہی کے نام سے مشہور ہے۔ قدیم تاریخوں میں کشتی کے ٹھیکرنے کی یہی جگہ بتائی گئی ہے۔ چنانچہ مسیح سے ڈھائی سو برس پہلے باہل کے ایک

ابْنِي مِنْ أَهْلِيٍّ وَإِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَأَنْتَ أَحْكَمُ الْحُكَمِينَ ﴿۵﴾ قَالَ يَنْوُحُ إِنَّهُ لَيْسَ مِنْ أَهْلِكَ إِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ رَبِّ فَلَا

میرا بیٹا میرے گھر والوں میں سے ہے اور تیرا وعدہ سچا ہے^[۳۸] اور تو سب حاکموں سے بڑا اور بہتر حاکم ہے۔^[۳۹]
جواب میں ارشاد ہوا^[۴۰] اے نوح، وہ تیرے گھر والوں میں سے نہیں ہے، وہ تو ایک بگڑا ہوا کام ہے،

مذہبی پیشوایر اس (Berasus) نے پرانی کلدانی روایات کی بنا پر اپنے ملک کی جوتارنخ لکھی ہے اس میں وہ کشی نوح کے ٹھیرنے کا مقام جو دی ہی بتاتا ہے۔ ارسطو کا شاگرد ابیدینوس (Abydenus) بھی اپنی تاریخ میں اس کی تصدیق کرتا ہے۔ نیز وہ اپنے زمانہ کا حال بیان کرتا ہے کہ عراق میں بہت سے لوگوں کے پاس اس کشی کے لکڑے حفظ ہیں جنہیں وہ گھول گھول کر بیماروں کو پلاتتے ہیں۔

یہ طوفان، جس کا ذکر بیہان کیا گیا ہے، عالمگیر طوفان تھا یا اس خاص علاقے میں آیا تھا جہاں حضرت نوح کی قوم آباد تھی؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا فیصلہ آج تک نہیں ہوا۔ اسرائیل روایات کی بنا پر عام خیال یہی ہے کہ یہ طوفان تمام روئے زمین پر آیا تھا (پیدائش ۷:۱۸-۲۲)۔ مگر قرآن میں یہ بات کہیں نہیں کہی گئی ہے۔ قرآن کے اشارات سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ بعد کی انسانی نسلیں انہی لوگوں کی اولاد سے ہیں جو طوفان نوح سے بچا لیے گئے تھے، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ طوفان تمام روئے زمین پر آیا ہو، کیونکہ یہ بات اس طرح بھی صحیح ہو سکتی ہے کہ اس وقت تک بنی آدم کی آبادی اسی خطہ تک محدود رہی ہو جہاں طوفان آیا تھا، اور طوفان کے بعد جو نسلیں پیدا ہوئی ہوں وہ بتدریج تمام دنیا میں پھیل گئی ہوں۔ اس نظریہ کی تائید و چیزوں سے ہوتی ہے۔ ایک یہ کہ دجلہ و فرات کی سر زمین میں تو ایک زبردست طوفان کا ثبوت تاریخی روایات سے، آثار قدیمہ سے اور طبقات الارض سے ملتا ہے، لیکن روئے زمین کے تمام خطوں میں ایسا کوئی ثبوت نہیں ملتا جس سے کسی عالمگیر طوفان کا لیقین کیا جاسکے۔ دوسرے یہ کہ روئے زمین کی اکثر و بیشتر قوموں میں ایک طوفان عظیم کی روایات قدیم زمانے سے مشہور ہیں، حتیٰ کہ آسٹریلیا، امریکہ اور نیونگی جیسے دور راز علاقوں کی پرانی روایات میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ کسی وقت ان سب قوموں کے آبادا جداد ایک ہی خطہ میں آباد ہوں گے جہاں یہ طوفان آیا تھا۔ اور پھر جب ان کی نسلیں زمین کے مختلف حصوں میں پھیلیں تو یہ روایات ان کے ساتھ گکھیں۔ (مالاحظہ سورہ عراف، حاشیہ ۷)

[۴۱] یعنی تو نے وعدہ کیا تھا کہ میرے گھر والوں کو اس تباہی سے بچا لے گا، تو میرا بیٹا بھی میرے گھر والوں ہی میں سے ہے، لہذا سے بھی بچا لے۔

[۴۲] یعنی تیرافیصلہ آخری فیصلہ ہے جس کا کوئی اپیل نہیں۔ اور تو جو فیصلہ بھی کرتا ہے خالص علم اور کامل انصاف کے ساتھ کرتا ہے۔

[۴۳] یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک شخص کے جسم کا کوئی عضو سرگیا ہو اور ڈاکٹر نے اس کو کاٹ چینکنے کا فیصلہ کیا ہو۔ اب وہ مریض ڈاکٹر سے کہتا ہے کہ یہ تو میرے جسم کا ایک حصہ ہے اسے کیوں کاٹتے ہو۔ اور ڈاکٹر اس کے جواب میں کہتا ہے کہ یہ تمہارے جسم کا حصہ نہیں رہا ہے کیونکہ یہ سرچکا ہے۔ لیں ایک صالح بپ سے اس کے نالائق بیٹھے کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ بیٹا تمہارے گھر والوں میں سے نہیں ہے یہ تو بگڑا ہوا کام ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے اسے پروٹش کرنے میں جو محنت کی وہ ضائع ہو گئی اور یہ کام بگڑ گیا اور اب صرف یہ بگڑا ہوا انسان تمہارے صالح خاندان کا فرد نہیں ہے۔ وہ تمہارے نسبی خاندان کا ایک رکن ہو تو ہوا کرے گر تمہارے اخلاقی خاندان سے اس کا کوئی رشتہ نہیں۔ اور آج جو فیصلہ کیا جا رہا ہے وہ کسی نسلی یا قومی نزاع کا نہیں، کفر و اسلام کی نزاع کا فیصلہ ہے جس میں صرف صالح بچا لیے جائیں گے اور فاسد مثالاً دیے جائیں گے۔

تَسْعَلُنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ إِنِّي أَعْظُمُكَ أَنْ تَكُونَ مِنَ
الْجَهَلِينَ ۝ قَالَ رَبِّي إِنِّي أَعُوذُ بِكَ أَنْ أَسْعَلَكَ مَا لَيْسَ
لِي بِهِ عِلْمٌ وَإِلَّا تَعْفِرُ لِي وَتَرْحَمْنِي أَكُنْ مِنَ الْخَسِيرِينَ ۝
قِيلَ يُنُوْحٌ اهْبِطْ بِسَلِّمٍ مِنَّا وَبَرَكْتِ عَلَيْكَ وَعَلَىٰ أُمِّهِ

لہذا تو اس بات کی مجھ سے درخواست نہ کر جس کی حقیقت تو نہیں جانتا، میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ اپنے آپ کو جاہلوں کی طرح نہ بنالے، [۵۰] نوح نے فوراً عرض کیا "اے میرے رب! میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ وہ چیز تجھ سے مانگوں جس کا مجھے علم نہیں۔" [۵۱] اگر تو نے مجھے معاف نہ کیا اور حم نہ فرمایا تو میں بر باد ہو جاؤں گا۔ [۵۲] حکم ہوا "اے نوح اتر جا، ہماری طرف سے سلامتی اور برکتیں ہیں تجھ پر اور ان گروہوں پر جو تیرے ساتھ ہیں،

[۵۰] اس ارشاد کو کیکوئی شخص یہ گمان نہ کرے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے اندر روح ایمان کی کمی تھی، یا ان کے ایمان میں جاہلیت کا کوئی شانہ تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ انبیاء بھی انسان ہی ہوتے ہیں، اور کوئی انسان بھی اس پر قادر نہیں ہو سکتا کہ ہر وقت اس بلند ترین معیار کمال پر قائم رہے جو مومن کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔ سماوات کی نازک نفیاتی موقع پر نبی جیسا اعلیٰ و اشرف انسان بھی تھوڑی دیر کے لیے اپنی بشری کمزوری سے مغلوب ہو جاتا ہے۔ لیکن جو نبی کا اسے یہ احساس ہوتا ہے، یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے احساس کر دیا جاتا ہے کہ اس کا قدم معیار مطلوب سے نیچے جا رہا ہے، وہ فوراً توبہ کرتا ہے اور اپنی غلطی کی اصلاح کرنے میں اسے ایک لمحہ کے لیے بھی تامل نہیں ہوتا۔ حضرت نوح کی اخلاقی رفتہ کا اس سے برا بیوتو اور کیا ہو سکتا ہے کہ ابھی جان جو جوں بیٹھا آنکھوں کے سامنے غرق ہوا ہے اور اس نظارہ سے کلیچہ منہ کو آر بابا ہے، لیکن جب اللہ تعالیٰ انہیں متبرہ فرماتا ہے کہ جس میئے نے حق کو چھوڑ کر باطل کا ساتھ دیا اس کو محض اس لیے اپنا سمجھنا کہ وہ تمہاری صلب سے پیدا ہوا ہے محض ایک جاہلیت کا جذبہ ہے، تو وہ فوراً اپنے دل کے زخم سے بے پرواہ کر اس طرز فکر کی طرف پلٹ کر آتے ہیں جو اسلام کا مقتضیا ہے۔

[۵۰ الف] یعنی ایسی درخواست کروں جس کے صحیح ہونے کا مجھے علم نہیں ہے۔

[۵۱] پس نوح کا یہ قصہ بیان کر کے اللہ تعالیٰ نے نہایت موثر پیرایہ میں یہ بتایا ہے کہ اس کا انصاف کس قدر بے لائگ اور اس کا فیصلہ کیسا دنوں کو ہوتا ہے۔ مشرکین کا یہ سمجھتے تھے کہ ہم خواہ کیسے ہی کام کریں، مگر ہم پر خدا کا غضب نازل نہیں ہو سکتا کیونکہ ہم حضرت ابراہیم کی اولاد اور فلاں فلاں دیویوں اور دیوتاؤں کے متول ہیں۔ یہودیوں اور عیسائیوں کے بھی ایسے ہی کچھ گمان تھے اور ہیں۔ اور بہت سے غلط کار مسلمان بھی اس قسم کے جھوٹے بھروسوں پر تکلیف کیے ہوئے ہیں کہ ہم فلاں حضرت کی اولاد اور فلاں حضرت کے دامن گرفتہ ہیں، ان کی سفارش ہم کو خدا کے انصاف سے چالے گی۔ لیکن یہاں یہ مظہر دکھایا گیا ہے کہ ایک جملہ القدر پیغمبر اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے لخت جگد کوڑا و بتبے ہوئے دیکھتا ہے اور تڑپ کر بیٹھے کی معافی کے لیے درخواست کرتا ہے، لیکن دربار خداوندی سے اٹھی اس پر ڈانٹ پڑ جاتی ہے اور باب کی پیغمبری بھی ایک بد عمل بیٹھے کو عذاب سے نہیں بچا سکتی۔

[۵۲] یعنی اس پہاڑ سے جس پر کشتی پھیری تھی۔

۴۷۰ مِنْ مَعَكَ وَأُمَّمَ سَنَمَتِعْهُمْ ثُمَّ يَسْهُمْ مَنَّا عَذَابٌ
 أَلِيمٌ ۝ تِلْكَ مِنْ أَثْبَاءِ الْغَيْبِ نُوْجِهَا إِلَيْكَ ۝ مَا كُنْتَ
 تَعْلَمُهَا أَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هَذَا فَاصْبِرْ ۝ إِنَّ الْعَاقِبَةَ
 لِلْمُتَقِينَ ۝ وَإِلَى عَادٍ أَخَاهُمْ هُوَدًا ۝ قَالَ يَقُولُمَا عَبْدُ وَاللَّهُ
 مَا لَكُمْ مِنْ إِلَهٍ غَيْرُهُ ۝ إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا مُفْتَرُونَ ۝ يَقُولُمَا
 أَسْعِلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا ۝ إِنْ أَجْرُى إِلَّا عَلَى اللَّذِي قَطَرَنِي

الْمَقْبِرَةَ وَالْمَدَنَاتَ وَالْمَدَنَاتَ
 وَالْمَدَنَاتَ وَالْمَدَنَاتَ وَالْمَدَنَاتَ

اور کچھ گروہ ایسے بھی ہیں جن کو تم کچھ مدت تک سامان زندگی بخشیں گے پھر انھیں ہماری طرف سے در دنا ک مذاب پہنچ گا۔

اے نبی، یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم تمہاری طرف دھی کر رہے ہیں۔ اس سے پہلے تم ان کو جانتے تھے اور نہ تمہاری قوم۔ پس صبر کرو، انجام کار متقویوں ہی کے حق میں ہے^[۵۳] اور عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہوڑو کو بھیجا۔^[۵۴] اُس نے کہا ”اے برادر ان قوم، اللہ کی بنندگی کرو، تمہارا کوئی خدا اس کے سوانحیں ہے۔ تم نے محض جھوٹ گھڑ رکھے ہیں۔^[۵۵] اے برادر ان قوم، اس کام پر میں تم سے کوئی اجر نہیں چاہتا، میرا اجر تو اس کے ذمہ ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے،

[۵۳] یعنی جس طرح نوح اور ان کے ساتھیوں ہی کا آخر کار بول بالا ہوا، اسی طرح تمہارا اور تمہارے ساتھیوں کا بھی ہو گا۔ خدا کا قانون یہی ہے کہ ابتداء کار میں دشمنان حق خواہ کتنے ہی کامیاب ہوں مگر آخري کامیابی صرف ان لوگوں کا حصہ ہوتی ہے جو خدا سے ڈر کر فکر و عمل کی غلط را ہوں سے بچتے ہوئے مقصد حق کے لیے کام کرتے ہیں۔ لہذا اس وقت جو مصالوب و شدائد تم پر گزر رہے ہیں، جن مشکلات سے تم دوچار ہو رہے ہو اور تمہاری دعوت کو دبانے میں تمہارے مخالفوں کو پہنچا جو کامیابی ہوتی نظر آ رہی ہے اس پر بد دل نہ ہو، بلکہ بہت اور صبر کے ساتھ اپنا کام کیے چلے جاؤ۔

[۵۴] سورہ اعراف روایت ۵ کے حوالی پیش نظر رہیں۔

[۵۵] یعنی وہ تمام دوسرے معبدوں جن کی تم بنندگی و پرستش کر رہے ہو حقیقت میں کسی قسم کی بھی خدائی صفات اور طاقتیں نہیں رکھتے۔ بنندگی و پرستش کا کوئی استحقاق ان کو حاصل نہیں ہے۔ تم نے خواہ مخواہ ان کو معبد بنار کھا ہے اور بلا وجہ ان سے حاجت روائی کی آس لگائے بیٹھے ہو۔

أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝ وَيَقُولُ أَسْتَغْفِرُ رَبِّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوا إِلَيْهِ
يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِدْرَارًا وَيَزِدُكُمْ قُوَّةً إِلَى قُوَّتِكُمْ وَلَا
تَتَوَلُوا مُجْرِمِينَ ۝ قَاتُلُوا يَهُودًا مَا حِشْتَنَا بِيَتِنَةٍ وَمَا نَحْنُ

کیا تم عقل سے ذرا کام نہیں لیتے؟^[۵۶] اور اے میری قوم کے لوگو، اپنے رب سے معافی چاہو، پھر اس کی طرف پلٹو، وہ تم پر آسمان کے دہانے کھول دے گا اور تمہاری موجودہ قوت پر مزید قوت کا اضافہ کرے گا۔^[۵۷] مجرم بن کر (بندگی سے) منہ نہ پھیرو، انہوں نے جواب دیا ”اے ہود، تو ہمارے پاس کوئی صریح شہادت لے کر نہیں آیا ہے، اور تیرے کہنے سے

[۵۶] یہ نہایت بلیغ فقرہ ہے جس میں ایک بڑا استدلال سمیٹ دیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ میری بات کو جس طرح سرسری طور پر تم نظر انداز کر رہے ہو اور اس پر سمجھیگی سے غور نہیں کرتے، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ تم لوگ عقل سے کام نہیں لیتے۔ ورنہ اگر تم عقل سے کام لینے والے ہو تو تو ضرور سوچتے کہ جو شخص اپنی کسی ذاتی غرض کے بغیر دعوت و تباہ اور تذکیر و نصیحت کی یہ سب مشقیں جھیل رہا ہے، جس کی اس تگ و دو میں تم کسی شخصی یا خاندانی مقادکا شاہین تک نہیں پہنچتے۔ وہ ضرور اپنے پاس یقین و اذعان کی کوئی ایسی بنیاد اور ضمیر کےطمینان کی کوئی ایسی وجہ رکھتا ہے جس کی بنیاد پر اس نے اپنا عیش و آرام چھوڑ کر، اپنی دنیا بنا نے کی فکر سے بے پرواہ کر، اپنے آپ کو اس جو حکم میں ڈالا ہے کہ صدیوں کے ہمیشے اور رچے ہوئے عقائد، رسوم اور طرز زندگی کے خلاف آواز اٹھائے اور اس کی بدولت دنیا بھر کی دشمنی مول لے لے۔ ایسے شخص کی بات کم از کم اتنی بے وزن تو نہیں ہو سکتی کہ بغیر سوچے سمجھے اسے یونہی نال دیا جائے اور اس پر سمجھیدہ غور و فکر کی ذرا سی تکلیف بھی ذہن کو نہ دی جائے۔

[۵۷] یہ وہی بات ہے جو پہلے رکوع میں محمد ﷺ سے کہلوائی گئی تھی کہ ”اپنے رب سے معافی مانگو اور اس کی طرف پلٹ آؤ تو وہ تم کو اچھا سامان زندگی دے گا۔“ اس سے معلوم ہوا کہ آخرت ہی میں نہیں اس دنیا میں بھی قوموں کی قسمتوں کا اتارتچھاوا اخلاقی بنیادوں ہی پر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس عالم پر جو فرماس روانی کر رہا ہے وہ اخلاقی اصولوں پر مبنی ہے نہ کہ اُن طبعی اصولوں پر جو اخلاقی خیر و شر کے امتیاز سے خالی ہوں۔ یہ بات کئی مقامات پر قرآن میں فرمائی گئی ہے کہ جب ایک قوم کے پاس نبی کے ذریعے سے خدا کا پیغام پہنچتا ہے تو اس کی قسم اُس پیغام کے ساتھ متعلق ہو جاتی ہے۔ اگر وہ اسے قبول کر لیتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر اپنی نعمتوں اور برکتوں کے دروازے کھول دیتا ہے۔ اگر رد کر دیتی ہے تو اسے تباہ کر دیا جاتا ہے۔ یہ گویا ایک دفعہ ہے اُس اخلاقی قانون کی جس پر اللہ تعالیٰ انسان کے ساتھ معاملہ کر رہا ہے۔ اسی طرح اس قانون کی ایک دفعہ یہ بھی ہے کہ جو قوم دنیا کی خوش حالی سے فریب کھا کر ظلم و معصیت کی را ہوں پر چل بلکہ ہے اس کا انجام بربادی ہے۔ لیکن یعنی اس وقت جب کہ وہ اپنے اس برے انجام کی طرف بگٹھ جلی جا رہی ہو، اگر وہ اپنی غلطی کو محسوں کر لے اور نافرمانی چھوڑ کر خدا کی طرف پلٹ آئے تو اس کی قسم بدلت جاتی ہے، اس کی مہلت عمل میں اضافہ کر دیا جاتا ہے اور مستقبل میں اس کے لیے عذاب کے بجائے انعام، برتری اور سرفرازی کا فیصلہ لکھ دیا جاتا ہے۔

[۵۸] یعنی ایسی کوئی کھلی علامت یا ایسی کوئی واضح دلیل جس سے ہم غیر مشتبہ طور پر معلوم کر لیں کہ اللہ نے تجھے بھیجا ہے اور جو بات تو پیش کر رہا ہے وہ حق ہے۔

بِتَارِكِ الْهَتَنَا عَنْ قُوْلَكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِينَ ۝
 إِنْ تَقُولُ إِلَّا اعْتَرَكَ بَعْضُ الْهَتَنَا إِسْوَءَ قَالَ إِنِّي أَشْهِدُ اللَّهَ
 وَأَشْهُدُ وَإِنِّي بِرِّيَّةٍ مِّمَّا تَشَرَّكُونَ ۝ مِنْ دُونِهِ فَكِيدُونِي جَمِيعًا
 ثُمَّ لَا تُنْظِرُونَ ۝ إِنِّي تَوَكَّلُ عَلَى اللَّهِ رَبِّي وَرَبِّكُمْ مَا مِنْ دَآبَةٍ
 إِلَّا هُوَ أَخْذِنَا صِدِّيقًا طَرَّانَ رَبِّي عَلَى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ۝ فَإِنْ
 تَوَلُّوا فَقَدْ أَبْلَغْتُكُمْ مَا أُرْسِلْتُ بِهِ إِلَيْكُمْ وَيَسْتَخِلْفُ رَبِّي قَوْمًا

ہم اپنے معبدوں کو نہیں چھوڑ سکتے، اور تجھ پر ہم ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ تیرے اوپر ہمارے معبدوں میں سے کسی کی مار پڑ گئی ہے۔^[۵۵]

ہوڈ نے کہا ”میں اللہ کی شہادت پیش کرتا ہوں“^[۵۶] اور تم گواہ رہو کہ یہ جو اللہ کے سوادوسروں کو تم نے خداوی میں شریک ٹھیکار کھا ہے اس سے میں بیزار ہوں^[۵۷]۔ تم سب کے سب مل کر میرے خلاف اپنی کرنی میں کسر نہ اٹھار کھو اور مجھے ذرا مہلت نہ دو^[۵۸]، میرا بھروسہ اللہ پر ہے جو میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی۔ کوئی جان دار ایسا نہیں جس کی چوٹی اس کے ہاتھ میں نہ ہو۔ بے شک میرا رب سیدھی راہ پر ہے۔^[۵۹] اگر تم منہ پھیرتے ہو تو پھیرلو۔ جو پیغام دے کر میں تمہارے پاس بھیجا گیا تھا وہ میں تم کو پہنچا چکا ہوں۔ اب میرا رب تمہاری جگہ دوسری قوم کو

[۵۶] یعنی تو نے کسی دیوی یاد یوتایا کسی حضرت کے آستانے پر کچھ گستاخی کی ہوگی، اسی کا خمیازہ ہے جو تو بھگت رہا ہے کہ بہکی بہکی با میں کرنے لگا ہے اور وہی بستیاں جن میں کل توزعت کے ساتھ رہتا تھا جن وہاں گالیوں اور پھر وہ سے تیری تواضع ہو رہی ہے۔

[۵۷] یعنی تم کہتے ہو کہ میں کوئی شہادت لے کر نہیں آیا، حالانکہ چھوٹی چھوٹی شہادتیں پیش کرنے کے بجائے میں تو سب سے بڑی شہادت اس خدا کی پیش کر رہا ہوں جو اپنی ساری خدائی کے ساتھ کائنات ہستی کے ہر گوشے اور ہر جلوے میں اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ جو حقیقتیں میں نے تم سے بیان کی ہیں وہ سراسر حق ہیں، ان میں جھوٹ کا کوئی شائبہ نہیں، اور جو تصورات تم نے قائم کر رکھے ہیں وہ بالکل افتراء ہیں، سچائی ان میں ذرہ برابر بھی نہیں۔

[۵۸] یہاں کی اس بات کا جواب ہے کہ تیرے کہنے سے ہم اپنے معبدوں کو چھوڑنے پر تیار نہیں ہیں۔ فرمایا میرا بھی یہ فیصلہ سن رکھو کہ تمہارے ان معبدوں سے میں قطعی بیزار ہوں۔

[۵۹] یہاں کے اس فقرے کا جواب ہے کہ ہمارے معبدوں کی تجھ پر مار پڑی ہے۔ (تفابل کے لیے ملاحظہ ہو یونس: ۱۷)

[۶۰] یعنی وہ جو کچھ کرتا ہے صحیح کرتا ہے۔ اس کا ہر کام سیدھا ہے۔ اس کے ہاں اندر ہر نگری نہیں ہے بلکہ وہ سراسر حق اور عدل کے ساتھ خدائی کر رہا ہے۔ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ تم مگر ادا و بد کار ہو اور پھر فلاح پاؤ، اور میں راست بازو نیکو کار ہوں اور پھر نوٹے میں رہوں۔

غَيْرُكُمْ وَلَا تَضْرُونَهُ شَيْئًا إِنَّ رَبِّنَا عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ حَفِظٌ^{۵۵}
وَلَهُجَاءَ أَمْرُنَا نَجِيْنَا هُوَدًا وَالَّذِينَ امْتُوا مَعَهُ بِرَحْمَةٍ مِّنْنَا
وَنَجَيْنَاهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيلٍ^{۵۶} وَتِلْكَ عَادُقَ جَحَدُوا بِاِبْرَاهِيمَ
وَعَصَوْا رَسُلَهُ وَاتَّبَعُوا اَمْرَكُلٍ جَبَارٍ عَنِيهِ^{۵۷} وَأَتَيْعُوا فِي هَذِهِ
الدُّنْيَا لَعْنَةً وَيَوْمَ الْقِيَمَةِ طَالَّا إِنَّ عَادًا كَفَرُوا رَبَّهُمْ طَالَّا بَعْدَهَا
لِعَادٍ قَوْمٌ هُوَدٌ^{۵۸} وَإِلَىٰ تَهْوِدَ أَخَاهُمْ صَلِحًا مَّا قَالَ يَقُولُمِاعْبُدُوا
اللَّهَ مَا لَكُمْ مِّنَ اللَّهِ غَيْرُهُ هُوَ أَنْشَأَكُمْ مِّنَ الْأَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ

اٹھائے گا اور تم اس کا کچھ نہ بگاڑ سکو گے۔^[۶۳] یقیناً میرا رب ہر چیز پر نگراں ہے۔، پھر جب ہمارا حکم آگیا تو ہم نے اپنی رحمت سے ہو دکو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے نجات دے دی اور ایک سخت عذاب سے انھیں بچا لیا۔

یہ بیس عاد، اپنے رب کی آیات سے انہوں نے انکار کیا، اس کے رسولوں کی بات نہ مانی،^[۶۴] اور ہر جبار دشمن حق کی پیروی کرتے رہے۔ آخر کار اس دنیا میں بھی ان پر پھٹکا رپڑی اور قیامت کے روز بھی۔ سنو! عاد نے اپنے رب سے کفر کیا۔ سنو! دور پھینک دیے گئے عاد، ہو دکی قوم کے لوگ یا اور شمود کی طرف ہم نے ان کے بھائی صالح کو بھیجا۔^[۶۵] اس نے کہا ”اے میری قوم کے لوگو، اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوتھا را کوئی خدا نہیں ہے۔ وہی ہے جس نے تم کو زمین سے پیدا کیا ہے اور یہاں تم کو بسا یا ہے۔^[۶۶]

[۶۳] یہاں کی اس بات کا جواب ہے کہ ہم تجھ پر ایمان لانے والے نہیں ہیں۔

[۶۴] اگر چنان کے پاس ایک ہی رسول آیا تھا، مگر جس چیز کی طرف اس نے دعوت دی تھی وہ وہی ایک دعوت تھی جو ہمیشہ ہر زمانے اور ہر قوم میں خدا کے رسول پیش کرتے رہے ہیں، اسی لیے ایک رسول کی بات نہ ماننے کو سارے رسولوں کی نافرمانی قرار دیا گیا۔

[۶۵] سورہ اعراف روایت ۱۰ کے حوالی پیش نظر ہیں۔

[۶۶] یہ دلیل ہے اس دعوے کی جو پہلے فقرے میں کیا گیا تھا کہ اللہ کے سوتھا را کوئی خدا اور کوئی حقیقی معبد نہیں ہے۔ مشرکین خود بھی اس بات کو تسلیم کرتے تھے کہ ان کا خالق اللہ ہی ہے۔ اسی مسلمہ حقیقت پر بنائے استدلال قائم کر کے حضرت صالح ان کو سمجھاتے ہیں کہ جب وہ اللہ ہی ہے جس نے زمین کے بے جان ما ذوں کی ترکیب سے تم کو یہ انسانی وجود بخشنا، اور وہ بھی اللہ ہی ہے جس نے زمین میں تم کو آباد کیا، تو پھر اللہ کے سو اخدانی اور کس کی ہو سکتی ہے اور کسی دوسرے کو یہ حق کیسے حاصل ہو سکتا ہے کہ تم اس کی بندگی پرستش کرو۔

فِيهَا فَاسْتَغْرِفُوكُمْ تُوبُوا إِلَيْهِ طَإِنَّ رَبِّيُّ قَرِيبٌ مُّجِيبٌ ۝
قَالُوا يُصْلِحُ قَدْ كُنْتَ فِينَا مُرْجُوا قَبْلَ هُذَا أَتَنْهَنَا آَنْ نَعْبُدُ

لہذا تم اُس سے معافی چاہو۔ [۲۸] اور اُس کی طرف پلٹ آؤ، یقیناً میرا رب قریب ہے اور وہ دعاوں کا جواب دینے والا ہے۔ [۲۹] انہوں نے کہا ”اے صالح، اس سے پہلے تو ہمارے درمیان ایسا شخص تھا جس سے بڑی توقعات وابستہ تھیں۔“ [۳۰] کیا تو ہمیں اُن معبودوں کی پرستش سے روکنا چاہتا ہے۔

[۲۸] یعنی اب تک جو تم دوسروں کی بندگی و پرستش کرتے رہے ہو اس جرم کی اپنے رب سے معافی مانگو۔

[۲۹] یہ شرکیں کی ایک بہت بڑی غلط فہمی کا رد ہے جو بالعموم ان سب میں پائی جاتی ہے، اور ان اہم اسباب میں سے ایک ہے جنہوں نے ہر زمانہ میں انسان کو شرک میں بتلا کیا ہے۔ یہ لوگ اللہ کو اپنے راجوں مہارا جوں اور بادشاہوں پر قیاس کرتے ہیں، جن کے دربار تک عام رعایا میں سے کسی کی رسانی نہیں ہو سکتی اور جن کے حضور میں کوئی رخواست {پہنچانے کے لیے بھی اور اس کا جواب حاصل کرنے کے لیے بھی} مقتربین بارگاہ میں سے کسی کا دامن تھامنا پڑتا ہے۔ اس غلط گمان کی وجہ سے یہ لوگ ایسا سمجھتے ہیں اور ہوشیار لوگوں نے ان کو ایسا سمجھا نے کی کوشش بھی کی ہے کہ خداوند عالم کا آستانہ قدس عام انسانوں کی وست رس سے بہت ہی دور ہے۔ اس کے دربار تک بھلا عام آدمی کی پہنچ کیسے ہو سکتی ہے۔ وہاں تک دعاوں کا پہنچنا اور پھر ان کا جواب ملتا تو کسی طرح ممکن ہی نہیں ہو سکتا جب تک کہ پاک روحوں کا وسیلہ نہ ڈھونڈا جائے اور ان مذہبی منصب داروں کی خدمات نہ حاصل کی جائیں جو اپر تک نذریں، نیازیں اور عرضیاں پہنچانے کے ڈھپ جانتے ہیں۔ یہی وہ غلط فہمی ہے جس نے بندے اور خدا کے درمیان بہت سے چھوٹے بڑے معبودوں اور سفارشیوں کا ایک جم غیر کھڑا کر دیا۔

حضرت صالح علیہ السلام جاہلیت کے اس پورے طسم کو صرف دلفتوں سے توڑھچکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ قریب ہے۔ دوسرا یہ کہ وہ دعاوں کا جواب دینے والا ہے۔ یعنی تمہارا یہ خیال بھی غلط ہے کہ تم سے دور ہے، اور یہ بھی غلط ہے کہ تم برادر راست اس کو پکار کر اپنی دعاوں کا جواب حاصل نہیں کر سکتے۔ تم میں سے ایک ایک شخص اپنے پاس ہی اس کو پاسکتا ہے، اس سے سرگوشی کر سکتا ہے، اپنی عرضیاں براو راست اس کے حضور پیش کر سکتا ہے۔ اور پھر وہ برادر راست اپنے ہر بندے کی دعاوں کا جواب بھی خود دیتا ہے۔ پس جب سلطان کائنات کا دربار عام ہر وقت ہر شخص کے قریب ہی موجود ہے تو یہم کس حماقت میں پڑے ہو کہ اس کے لیے واسطے اور سفارشی ڈھونڈتے پھرتے ہو۔ (نیز ملاحظہ ہوسورہ بقرہ کا حاشیہ نمبر ۱۸۸)

[۳۰] یعنی تمہاری ہوش مندی، ذکاوت، فراست، سنجیدگی و متنانت اور پروقار خصیت کو دیکھ کر ہم یہ امیدیں لگائے بیٹھے تھے کہ بڑے آدمی بنو گے۔ اپنی دنیا بھی خوب بناوے گے اور ہمیں بھی دوسروں تو میوں اور قبیلوں کے مقابلے میں تمہارے مذہب سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملے گا۔ مگر تم نے یہ توحید اور آخرت کا نیاراگ چھیڑ کر تو ہماری ساری امیدیوں پر پانی پھیردیا۔ یاد رہے کہ ایسے ہی کچھ خیالات محمد ﷺ کے متعلق بھی آپ کے ہم قوموں میں پائے جاتے تھے۔ وہ بھی نبوت سے پہلے آپ کی بہترین قابلیتوں کے معرفت تھے اور اپنے نزدیک یہ سمجھتے تھے کہ یہ شخص ایک بہت بڑا تاجر بنے گا اور اس کی بیدار مخفری سے ہم کو بھی بہت کچھ فائدہ پہنچے گا۔ مگر جب ان کی توقعات کے خلاف آپ نے توحید اور آخرت اور مکارم اخلاق کی دعوت دینی شروع کی تو وہ آپ سے نہ صرف مایوس بلکہ بیزار ہو گئے اور کہنے لگے کہ اچھا خاصاً کام کا آدمی تھا، خدا جانے اسے کیا جنون لاحق ہو گیا کہ اپنی زندگی بھی بر بادی اور ہماری امیدیوں کو بھی خاک میں ملا دیا۔

مَا يَعْبُدُ أَبَا وَإِنَّا لَفِي شَكٍّ مِّهَا تَدْعُونَا إِلَيْهِ مُرِيْبٌ ۝
 قَالَ يَقُولُ مَرَءٌ يَتَمَرَّدُ إِنْ كَذَّ عَلَى بَيْنَةٍ مِّنْ رَّزْقٍ وَاتَّدْفَنَ مِنْهُ
 رَّحْمَةً فَمَنْ يَنْصُرِنِي مِنَ اللَّهِ إِنْ عَصَيْتَهُ فَقَمَّا تَزَيِّدُ وَتَنْتَيْ
 غَيْرَ رَحْمَسِيْرٌ ۝ وَيَقُولُ هُذِّهَا نَاقَةُ اللَّهِ لَكُمْ أَيَّهَا فَذَرُوهَا تَأْكُلُ

جن کی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے تھے؟ [۱] تو جس طریقے کی طرف ہمیں بلا رہا ہے اس کے بارے میں ہم کو سخت شبہ ہے جس نے ہمیں خلبان میں ڈال رکھا ہے۔ [۲]

صالح نے کہا ”اے برادر ان قوم، تم نے کچھ اس بات پر بھی غور کیا کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک صاف شہادت رکھتا تھا، اور پھر اس نے اپنی رحمت سے بھی مجھ کو نواز دیا تو اس کے بعد اللہ کی پکڑ سے مجھ کوں بچائے گا اگر میں اس کی نافرمانی کروں؟ تم میرے کس کام آسکتے ہو سوائے اس کے کہ مجھے اور زیادہ خسارے میں ڈال دو۔“ [۳]

اور اے میری قوم کے لوگو، دیکھو یہ اللہ کی اونٹی تمہارے لیے ایک نشانی ہے۔

[۱] یہ گویدا لیل ہے اس امر کی کہ یہ معبدوں کی عبادت کے مختص ہیں {پتوں کہ باپ دادا کے وقت سے ان کی عبادت ہوتی چل آ رہی ہے اس لیے} ان کی عبادت ترک نہیں کی جاسکتی۔

[۲] یہ شہہ اور یہ خلبان کس امر میں تھا؟ اس کی کوئی تصریح یہاں نہیں کی گئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خلبان میں تو سب پڑ گئے تھے، مگر ہر ایک کا خلبان الگ نوعیت کا تھا۔ یہ دعوت حق کی خصوصیات میں سے ہے کہ جب وہ اٹھتی ہے تو لوگوں کا اطمینان قلب رخصت ہو جاتا ہے اور ایک عام بے کلی بیدا ہو جاتی ہے۔ اگرچہ ہر ایک کے احساسات دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں مگر اس بے کلی میں سے سب کو کچھ نہ کچھ حصہ ضرور مل کر رہتا ہے۔ اس سے پہلے جس اطمینان کے ساتھ لوگ اپنی مذلا توں میں منہک رہتے تھے اور کبھی یہ سوچنے کی ضرورت محسوس ہی نہ کرتے تھے کہ ہم کیا کر رہے ہیں، وہ اطمینان اس دعوت کے اٹھنے کے بعد باقی نہیں رہتا اور نہیں رہ سکتا۔ نظام جاہلیت کی مکروہ یوں پرداعی حق کی بے رحم تقدیم، اثبات حق کے لیے اس کے پرزو اور دل لگتے والائیں، پھر اس کے بلند اخلاق، اس کا عزم، اس کا حلم، اس کی شرافت نفس، اس کا نہایت کھرا اور است بازانہ رویہ اور اس کی وہ زبردست حکیمانہ شان جس کا سکھہ بڑے سے بڑے ہٹ دھرم مخالف کے دل پر بھی بیٹھ جاتا ہے، پھر وقت کی سوسائٹی میں سے بہترین عناصر کا اس سے متاثر ہوتے چلے جانا اور ان کی زندگیوں میں دعوت حق کی تاثیر سے غیر معمولی انقلاب رونما ہونا، یہ ساری چیزیں مل جل کر ان سب لوگوں کے دلوں کو بے چین کر ڈالتی ہیں جو حق آ جانے کے بعد بھی پرانی جاہلیت کا بول بالا رکھنا چاہتے ہیں۔

[۳] یعنی اگر میں اپنی بصیرت کے خلاف اور اس علم کے خلاف جو اللہ نے مجھے دیا ہے، محض تم کو خوش کرنے کے لیے گراہی کا طریقہ اختیار کرلوں تو یہی نہیں کہ خدا کی پکڑ سے تم مجھ کو بچانے سکو گے، بلکہ تمہاری وجہ سے میرا جرم اور زیادہ بڑھ جائے گا اور اللہ تعالیٰ مجھے اس بات کی مزید سزا دے گا کہ میں نے تم کو سیدھا راستہ بتانے کے بجائے تمہیں جان بوجھ کرالا اور گمراہ کر دیا۔

۵۳ فِيْ أَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَهْسُوْهَا سُوْءٌ فِيْ أَخْذِكُمْ عَذَابٌ قَرِيبٌ
 ۵۴ فَعَقَرُ وُهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوا فِيْ دَارِكُمْ ثَلَثَةَ أَيَّامٍ ذُلْكَ وَعْدٌ
 ۵۵ غَيْرُ مَكْنُونٍ وَبِهِ فَلَمَّا جَاءَهُمْ نَجَّيْنَا صَلِحًا وَالَّذِينَ آمَنُوا
 ۵۶ مَعَهُ بِرَحْمَةِ مِنْنَا وَمِنْ خَزْنِيْ يَوْمَيْنِ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ
 ۵۷ الْعَزِيزُ ۵۸ وَأَخْذَ الَّذِينَ ظَلَمُوْا الصَّيْحَةُ فَاصْبَحُوا فِيْ دِيَارِهِمْ
 ۵۹ جِئْنِيْنَ ۶۰ كَانُ لَمْ يَغْنُوْ فِيهَا طَلَبُهُمْ إِنَّ شَهْوَدًا كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ لَا
 ۶۱ بُعدًا الشَّهْوَدُ ۶۲ وَلَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُنَا إِبْرَاهِيمَ بِانْبُشْرِي قَالُوا
 ۶۳ سَلِمًا ۶۴ قَالَ سَلِمٌ فَهَا لِيْثٌ أَنْ جَاءَهُ بِعِجْلٍ حَنِيْدٌ ۶۵ فَلَمَّا رَأَ

اسے خدا کی زمین میں چرنے کے لیے آزاد چھوڑ دو۔ اس سے ذرا تعجب نہ کرنا اور نہ کچھ زیادہ درینہ گزرے گی کہ تم پر خدا کا عذاب آجائے گا۔“ مگر انہوں نے اونٹی کو مارڈا۔ اس پر صالح نے ان کو خبردار کر دیا کہ ”بس اب تین دن اپنے گھروں میں اورہ بس لو۔ یہ ایسی میعاد ہے جو جھوٹی نہ ثابت ہوگی۔“ آخر کار جب ہمارے فیصلے کا وقت آگیا تو ہم نے اپنی رحمت سے صالح کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے بحالیا اور اس دن کی روایتی سے ان کو محفوظ رکھا۔ [۱] بے شک تیر ارب ہی دراصل طاقت و را اور بالا دست ہے۔ رہے وہ لوگ جنہوں نے ظلم کیا تھا تو ایک سخت دھماکے نے ان کو دھر لیا اور وہ اپنی بستیوں میں اس طرح بے حس و حرکت پڑے کے پڑے رہ گئے کہ گویا وہ وہاں کبھی بے ہی نہ تھے۔ سنو! شہود نے اپنے رب سے کفر کیا۔ سنو! دور پھینک دیے گئے شہود! اع

اور دیکھو، ابراہیم کے پاس ہمارے فرشتے خوش خبری لیے ہوئے پہنچے۔ کہا تم پر سلام ہو۔ ابراہیم نے جواب دیا تم پر بھی سلام ہو۔ پھر کچھ درینہ گزری کہ ابراہیم ایک بھنا ہوا پچھڑا (ان کی ضیافت کے لیے) لے آیا۔ [۲] مگر جب

[۳] جزیرہ نمائے یعنیں جو روایات مشہور ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جب شہود پر عذاب آیا تو حضرت صالح بھرت کر کے وہاں چلے گئے تھے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ والے پہاڑ کے قریب ہی ایک پہاڑی کا نام بنی صالح ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہی جگہ آس جناب کی جائے قیام تھی۔

[۴] اس سے معلوم ہوا کہ فرشتے حضرت ابراہیم کے ہاں انسانی صورت میں پہنچے تھے اور ابتداءً انہوں نے اپنا تعارف نہیں کرایا تھا، اس لیے حضرت ابراہیم نے خیال کیا کہ یہ کوئی اپنی مہماں ہیں اور ان کے آتے ہی فوراً ان کی ضیافت کا انتظام فرمایا۔

أَيْدِيهِمْ لَا تَصِلُ إِلَيْهِ نِكَرَهُمْ وَأَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً قَالُوا لَا
تَخَفْ إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَى قَوْمٍ لُّوطٍ وَأَمْرَأَتُهُ قَائِمَةً فَضَحِّكَتْ
فَبَشَّرْنَاهَا بِإِسْحَاقَ لَا وَمِنْ وَرَاءِ إِسْحَاقَ يَعْقُوبَ قَالَتْ يَا وَيْلَتِي

[۷۵] دیکھا کہ ان کے ہاتھ کھانے پر نہیں بڑھتے تو وہ ان سے مشتبہ ہو گیا اور دل میں ان سے خوف محسوس کرنے لگا۔
انہوں نے کہا ”ڈر نہیں، ہم تو لوٹ کی قوم کی طرف بھیج گئے ہیں۔“ ابراہیم کی بیوی بھی کھڑی ہوئی تھی۔ وہ یہ سن کر
ہنس دی۔ [۷۶] پھر ہم نے اس کو اسحاق اور اسحاق کے بعد یعقوب کی خوشخبری دی۔ [۷۷] وہ بولی ”ہائے میری کم بختی!“

[۷۸] الف] اس سے حضرت ابراہیم کو معلوم ہوا کہ یہ فرشتے ہیں۔

[۷۹] بعض مفسرین کے نزد یہ خوف اس بنا پر تھا کہ جب ان انجینی نو واردوں نے کھانے میں تامل کیا تو حضرت ابراہیم کو
ان کی نیت پر شہید ہونے لگا اور آپ اس خیال سے اندیشناک ہوئے کہ کہیں کسی دشمنی کے ارادے سے تو نہیں آئے ہیں، کیونکہ عرب
میں جب کوئی شخص کسی کی غیافت قول کرنے سے انکار کرتا تو اس سے یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ مہمان کی حیثیت سے نہیں آیا ہے بلکہ قتل و
غارت کی نیت سے آیا ہے۔ لیکن بعد کی آیت اس تفسیر کی تائید نہیں کرتی۔

[۸۰] اس انداز کلام سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کھانے کی طرف ان کے ہاتھ نہ بڑھنے سے ہی حضرت ابراہیم تازگے تھے کہ
یہ فرشتے ہیں۔ اور چونکہ فرشتوں کا علاویہ انسانی شکل میں آنے غیر معمولی حالات ہی میں ہوا کرتا ہے اس لیے حضرت ابراہیم کو خوف جس
بات پر ہوا وہ دراصل یہ تھی کہ کہیں آپ کے گھر والوں سے یا آپ کی بستی کے لوگوں سے یا خود آپ سے کوئی ایسا تصور تو نہیں ہو گیا ہے
جس پر گرفت کے لیے فرشتے اس صورت میں بھیج گئے ہیں۔ اگر بات وہ ہوتی جو بعض مفسرین نے تھی ہے تو فرشتے یوں کہتے کہ ”ڈر
نہیں ہم تمہارے رب کے بھیج ہوئے فرشتے ہیں۔“ لیکن جب انہوں نے آپ کا خوف دور کرنے کے لیے کہا کہ ”ہم تو قوم لوٹ کی
طرف بھیج گئے ہیں“ تو اس سے معلوم ہوا کہ ان کا فرشتہ ہونا تو حضرت ابراہیم جان گئے تھے، البتہ پریشانی اس بات کی تھی کہ یہ حضرات
اس فتنے اور آزمائش کی شکل میں جو تشریف لائے ہیں تو آخروہ بد نصیب کون ہے جس کی شامت آنے والی ہے۔

[۸۱] اس سے معلوم ہوا کہ فرشتوں کے انسانی شکل میں آنے کی خرسنیت ہی سارا گھر پر یہاں ہو گیا تھا اور حضرت ابراہیم کی
اہلیہ بھی گھبرائی ہوئی باہر نکل آئی تھیں۔ پھر جب انہوں نے یہن لیا کہ ان کے گھر پر یا ان کی بستی پر کوئی آفت آنے والی نہیں ہے تو کہیں
ان کی جان میں جان آئی اور وہ خوش ہو گئی۔

[۸۲] فرشتوں نے حضرت ابراہیم کے بجائے حضرت سارہ کو یہ خوشخبری اس لیے سنائی کہ اس سے پہلے حضرت ابراہیم کے
ہاں تو ان کی دوسری بیوی حضرت ہاجرہ سے سیدنا مسلم علیہ السلام پیدا ہو چکے تھے، مگر حضرت سارہ اس وقت تک بے اولاد تھیں اور اس بنا
پر دل انہی کا زیادہ نگلیگن تھا۔ ان کے اس غم کو دور کرنے کے لیے فرشتوں نے انہیں صرف یہی خوشخبری نہیں سنائی کہ تمہارے ہاں اسحاق
جبیسا جیلیل القدر بیٹا پیدا ہو گا بلکہ یہ بھی تایا کہ اس بیٹے کے بعد پوتا بھی یعقوب حبیبا عالی شان پیغمبر ہو گا۔

[۸۳] اس کا مطلب نہیں ہے کہ حضرت سارہ فی الواقع اس پر خوش ہونے کے بجائے اسی کو کبھی سمجھتی تھیں۔ بلکہ دراصل یہ اس قسم
کے الفاظ میں سے ہے جو عورتیں بالعوم تجھ کے موقع پر بولا کرتی ہیں اور جن سے لغوی معنی مراد نہیں ہوتے بلکہ مخصوص اٹھتا تجھ مقسم ہوتا ہے۔

ءَأَلْدُ وَأَنَا عَجُوزٌ وَهَذَا بَعْلٌ شَيْحًا طَإِنَّ هَذَا الشَّيْءُ عَجِيبٌ ۝
 قَالُوا أَتَعْجَبُونَ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ رَحْمَةُ اللَّهِ وَبَرَكَتُهُ عَلَيْكُمْ
 أَهْلَ الْبَيْتِ إِنَّهُ حَمِيدٌ مَّحِيدٌ ۝ فَلَمَّا ذَهَبَ عَنِ إِبْرَاهِيمَ
 الرَّوْعُ وَجَاءَتُهُ الْبُشْرَى يُجَادِلُنَا فِي قَوْمٍ لُوطٍ ۝ إِنَّ
 إِبْرَاهِيمَ لَحَلِيمٌ أَوَّلًا مُنِيبٌ ۝ يَا إِبْرَاهِيمَ أَغْرِضْ عَنْ
 هَذَا إِنَّهُ قَدْ جَاءَ أَمْرُرِيلَ وَإِنَّهُمْ أَتَيْهُمْ عَذَابٌ غَيْرُ

کیا اب میرے ہاں اولاد ہوگی جب کہ میں بڑھیا پھونس ہو گئی اور میرے میاں بھی بوڑھے ہو چکے؟ [۸۱] یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔ فرشتوں نے کہا ”اللہ کے حکم پر تجب کرتی ہو؟ ابراہیم کے گھر والوں، تم لوگوں پر تو اللہ کی رحمت اور اُس کی برکتیں ہیں، اور یقیناً اللہ نہایت قابل تعریف اور بڑی شان والا ہے۔“ پھر جب ابراہیم کی گھبراہٹ دور ہو گئی اور (اولاد کی بشارت سے) اس کا دل خوش ہو گیا تو اس نے قوم لوط کے معاملہ میں ہم سے جھگڑا شروع کیا۔ [۸۲] حقیقت میں ابراہیم بڑا حلیم اور نرم دل آدمی تھا اور ہر حال میں ہماری طرف رجوع کرتا تھا۔ (آخراں ہمارے فرشتوں نے اس سے کہا) ”اے ابراہیم، اس سے بازاً جاؤ، تمہارے رب کا حکم ہو چکا ہے اور اب ان لوگوں پر وہ عذاب آ کر رہے گا جو کسی کے پھر نہیں پھر سکتا۔“ [۸۳]

[۸۱] بائبل سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم کی عمر اس وقت ۱۰۰ برس اور حضرت سارہ کی عمر ۹۰ برس کی تھی۔

[۸۲] مطلب یہ ہے کہ اگرچہ عادتاً اس عمر میں انسان کے ہاں اولاد نہیں ہوا کرتی، لیکن اللہ کی تدرست سے ایسا ہونا کچھ بعد بھی نہیں ہے۔ اور جب کہ یہ خوشخبری تم کو اللہ کی طرف سے دی جا رہی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ تم چیزیں ایک مومنہ اس پر تجب کرے۔

[۸۳] ”جھگڑے“ کا لفظ اس موقع پر اُس انتہائی محبت اور ناز کے تعلق کو ظاہر کرتا ہے جو حضرت ابراہیم اپنے خدا کے ساتھ رکھتے تھے۔ اس لفظ سے یہ تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے کہ بندے اور خدا کے درمیان بڑی دیریتک روکد جاری رہتی ہے۔ بنده اصرار کر رہا ہے کہ کسی طرح قوم لوط پر سے عذاب ناٹال دیا جائے۔ خدا جواب میں کہہ رہا ہے کہ یہ قوم اب خر سے بالکل خالی ہو چکی ہے اور اس کے جرائم اس حد سے گزر چکے ہیں کہ اس کے ساتھ کوئی رعایت کی جاسکے۔ مگر بندہ ہے کہ پھر یہی کہے جاتا ہے کہ ”پرو دگار، اگر کچھ تھوڑی سی بھلانی بھی اس میں باقی ہو تو اسے اور ذرا مہلت دیدے، شاید کہ وہ بھلانی پھل لے آئے۔“ بائبل میں اس جھگڑے کی کچھ تشریح بھی بیان ہوئی ہے، لیکن قرآن کا بھل بیان اپنے اندر اس سے زیادہ معنوی وسعت رکھتا ہے۔ (قابل کے لیے ملاحظہ ہو کتاب پیدائش، باب ۱۸۔ آیت ۲۳-۳۲)

[۸۴] اس سلسلہ بیان میں حضرت ابراہیم کا یہ واقع، خصوصاً قوم لوط کے قصے کی تمهید کے طور پر، جس مناسبت سے بیان کیا گیا

مَرْدُوفٌ ۚ وَلَيَّا جَاءَتْ رُسُلُنَا لُوَّطًا سَيِّعَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ
ذَرْعًا ۖ وَقَالَ هَذَا يَوْمٌ عَصِيبٌ ۚ وَجَاءَهُ قَوْمٌ يُهْرَأُونَ

اور جب ہمارے فرشتے لوٹ کے پاس پہنچ [۸۵] تو ان کی آمد سے وہ بہت گھبرا یا اور دل تنگ ہوا اور کہنے لگا کہ آج بڑی مصیبت کا دن ہے۔ [۸۶] (ان مہمانوں کا آنا تھا کہ) اس کی قوم کے لوگ بے اختیار اس کے گھر کی طرف ہے اسے سمجھنے کے لیے حسب ذیل دو باتوں کو پیش نظر کیے:

(۱) مخاطب قریش کے لوگ میں جو حضرت ابراہیمؑ کی اولاد ہونے کی وجہ سے اس گھمنڈ میں بیٹلا ہیں کہ ہم پر خدا کا غضب کیسے نازل ہو سکتا ہے۔ اس پندر غلط کو توڑنے کے لیے پہلے تو انہیں یہ مظہر دکھایا گیا کہ حضرت نوحؑ جیسا ظیم الشان پیغمبر اپنی انکھوں کے سامنے اپنے جگر گوشے کو ڈو بتے دیکھ رہا ہے اور ترپ کر خدا سے دعا کرتا ہے کہ اس کے بیٹے کو بچالیا جائے مگر صرف یہی نہیں کہ اس کی سفارش بیٹے کے کچھ کام نہیں آتی، بلکہ اس سفارش پر باپ کو ائمہ ڈانت سننی پڑتی ہے۔ اس کے بعد اب یہ دوسرا مظہر خود حضرت ابراہیمؑ کا دکھایا جاتا ہے کہ ایک طرف تو ان پر بے پایا عنایات ہیں اور نہایت پیار کے انداز میں ان کا ذکر ہو رہا ہے، مگر دوسری طرف جب وہی ابراہیمؑ خلیل انصاف کے معاملہ میں دخل دیتے ہیں تو ان کے اصرار والی الحاح کے باوجود اللہ تعالیٰ مجرم قوم کے معاملے میں ان کی سفارش کو رد کر دیتا ہے۔

(۲) اس تقریر میں یہ بات بھی قریش کے ذہن نہیں کرنی مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ کا وہ قانون مکافات، جس سے یہ لوگ بالکل بے خوف اور مطمئن بیٹھے ہوئے تھے، کس طرح تاریخ کے دوران میں تسلسل اور باقاعدگی کے ساتھ ظاہر ہوتا رہا ہے۔ ایک طرف حضرت ابراہیمؑ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ {ان کی حق پرستی اور} حسن عمل کا بدلہ یہ دیتا ہے کہ ان کی بانجھ بیوی سے احتجاج علیہ السلام پیدا ہوتے ہیں، پھر ان کے ہاں یعقوب علیہ السلام کی پیدائش ہوتی ہے، اور ان سے بنی اسرائیل کی وہ عظیم الشان نسل چلتی ہے جس کی عظمت کے ڈنکے صدیوں تک اسی فلسطین و شام میں بجتہ رہے جہاں حضرت ابراہیمؑ ایک بے خانماں مہاجر کی حیثیت سے آ کر آباد ہوئے تھے۔ دوسری طرف قوم لوٹ ہے جو اسی سر زمین کے ایک حصہ میں اپنی خوش حالی پر گلن اور اپنی بدکاریوں میں مست ہے اور لوٹ علیہ السلام کی نصیحتوں کو وہ چنگیوں میں اڑا رہی ہے۔ مگر جس تاریخ کو ابراہیمؑ کی نسل سے ایک بڑی اقبال مندوں کے اٹھائے جانے کا فیصلہ لیا جاتا ہے، ٹھیک وہی تاریخ ہے جب اس بدکار قوم کو دنیا سے نیست و نابود کرنے کا فرمان نافذ ہوتا ہے اور وہا یہی عبرت ناک طریقے سے فنا کی جاتی ہے کہ آج اس کی بستیوں کا نشان کہیں ڈھونڈنے نہیں ملتا۔

[۸۵] سورہ اعراف رکوع ۱۰ کے حوالی پیش نظر ہیں۔

[۸۶] اس قصہ کی جو تفصیلات قرآن مجید میں بیان ہوئی ہیں ان کے فوائد کلام سے یہ بات صاف متوجہ ہوتی ہے کہ یہ فرشتے خوبصورت لڑکوں کی شکل میں حضرت لوٹ کے ہاں پہنچتے اور حضرت لوٹ اس بات سے بے خر تھے کہ یہ فرشتے ہیں۔ یہی سب تھا کہ ان مہمانوں کی آمد سے آپ کوخت پریشانی و دل تنگی لاحق ہوئی۔ اپنی قوم کو جانتے تھے کہ وہ کیسی بدکار اور کتنی بے حیا ہو چکی ہے۔

إِلَيْهِ۝ وَمِنْ قَبْلٍ كَانُوا يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ۝ قَالَ يَقُولُ
هُوَ لَا إِلَهَ إِلَّا نَحْنُ۝ أَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللَّهَ۝ وَلَا تُخْزُنُ رُفِيْعَ۝
صَيْقَنِ۝ أَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَشِيدٌ۝ قَالُوا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا۝
فِي بَنْتِكَ مِنْ حَقٍ۝ وَإِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا تُرِيدُ۝ قَالَ لَوْلَا۝
لَيْ بِكُمْ قُوَّةٌ۝ أَوْ أُوْيٌ۝ إِلَى رُكْنٍ شَدِيدٍ۝ قَالُوا يَلْوُظُ إِنَّا۝

دوڑ پڑے۔ پہلے سے وہ ایسی ہی بدکاریوں کے خوگر تھے۔ لوٹ نے ان سے کہا ”بھائیو، یہ میری بیٹیاں موجود ہیں، یہ تمہارے لیے پا کیزہ تر ہیں۔“ [۸۷] کچھ خدا کا خوف کرواد مریرے مہمانوں کے معاملہ میں مجھے ذلیل نہ کرو۔ کیا تم میں کوئی بھلا آدمی نہیں؟“ انہوں نے جواب دیا ”تجھے نو معلوم ہی ہے کہ تیری بیٹیوں میں بھار کوئی حصہ نہیں ہے“ [۸۸] اور تو یہ بھی جانتا ہے کہ ہم چاہتے کیا ہیں۔ ”لوٹ نے کہا“ کاش میرے پاس اتنی طاقت ہوتی کہ تمہیں سیدھا کر دیتا، یا کوئی مضبوط سہارا ہی ہوتا کہ اس کی پناہ لیتا۔“ تب فرشتوں نے اس سے کہا کہ ”اے لوٹ !

[۸۷] ہو سکتا ہے کہ حضرت لوٹ کا اشارہ قوم کی بڑیوں کی طرف ہو۔ کیونکہ نبی اپنی قوم کے لیے بخوبیہ باپ ہوتا ہے اور قوم کی لڑکیاں اس کی نگاہ میں اپنی بیٹیوں کی طرح ہوتی ہیں۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کا اشارہ خود اپنی صاحبزادیوں کی طرف ہو۔ بہر حال دونوں صورتوں میں یہ مگان کرنے کی وجہ نہیں ہے کہ حضرت لوٹ نے ان کے سامنے اپنی بیٹیوں کو زنا کے لیے پیش کیا تھا۔ ”یہ تمہارے لیے پا کیزہ تر ہیں“، کافرہ ایسا غلط مفہوم یعنی کہ کوئی کجھ ایش نہیں چھوڑتا۔ حضرت لوٹ کا منشا صاف طور پر یہ تھا کہ اپنی شہوت نفس کو اس فطری اور جائز طریقے سے پورا کرو جو اللہ نے مقرر کیا ہے اور اس کے لیے عورتوں کی کمی نہیں ہے۔

[۸۸] یقہرہ ان لوگوں کے نفس کی پوری تصویر کھینچ دیتا ہے کہ وہ جاذشت میں کس قدر ڈوب گئے تھے۔ بات صرف اس حد تک ہی نہیں رہی تھی کہ وہ فطرت اور پا کیزگی کی راہ سے ہٹ کر ایک گندی خلاف فطرت راہ پر چل پڑے تھے بلکہ نوبت بہاں تک پہنچ گئی تھی کہ ان کی ساری رغبت اور تمام دلچسپی اب اسی گندی راہ ہی میں تھی۔ ان کے نفس میں اب طلب اس گندگی ہی کی رہ گئی تھی اور وہ فطرت اور پا کیزگی کی راہ کے متعلق یہ کہنے میں کوئی شرم محسوس نہ کرتے تھے کہ یہ راستہ توہارے لیے بنائی نہیں ہے۔ یہ اخلاق کے زوال اور نفس کے لگاڑ کا انتہائی مرتبہ ہے جس سے فروڑ کسی مرتبے کا اتصور نہیں کیا جاسکتا۔ اس شخص کا معاملہ توہہت ملکا ہے جو حضن نفس کی کمزوری کی وجہ سے حرام میں مبتلا ہو جاتا ہو مگر حلال کو چاہنے کے قابل اور حرام کو پہنچنے کے قابل چیز سمجھتا ہو۔ ایسا شخص کبھی سدھر بھی سکتا ہے، اور نہ سدھرے تب بھی زیادہ سے زیادہ بھی کہا جائے ہے کہ وہ ایک گہڑا ہوا انسان ہے۔ مگر جب کسی شخص کی ساری رغبت صرف حرام ہی میں ہو اور وہ سمجھ کے حلال اس کے لیے ہے، ہی نہیں تو اس کا شمار انسانوں میں نہیں کیا جاسکتا۔ وہ اصل ایک گندا کیڑا ہے جو غلطت ہی میں پروردش پاتا ہے اور طبیعت سے اس کے مزاج کو کوئی مناسبت نہیں ہوتی۔ ایسے کیڑے اگر کسی صفائی پسند انسان کے گھر میں پیدا ہو جائیں تو وہ پہلی فرصت میں فینائل ڈال کر ان کے وجود سے اپنے گھر کو پاک کر دیتا ہے۔ پھر بھلا خدا اپنی زمین پر ان گندے کیڑوں کے اجتماع کو کب تک گوارا کر سکتا تھا۔

رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَصِلُوا إِلَيْكَ فَأَسْرِرْ يَا هَلْكَ بِقِطْعٍ مِّنَ
الَّيْلِ وَلَا يُلْتَفِتْ مِنْكُمْ أَحَدٌ إِلَّا امْرَاتُكَ طِإَّنَهُ مُصِيْبَهَا
مَا أَصَابَهُمْ طِإَّنَ مَوْعِدَهُمُ الصَّبْحُ طِإَّنَ لَيْسَ الصَّبْحُ بِقَرِيبٍ ۝
فَلَمَّا جَاءَهُمْ أَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيهَا سَافِلَهَا وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهَا
حِجَارَةً مِّنْ سِجِيلٍ لَا مَنْصُودٍ ۝ مُسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ طِإَّنَ
وَمَا هِيَ مِنَ الظَّلِيمِينَ بَعِيْدًا ۝ وَإِلَى مَدِيْنَ أَخَاهُمْ هَلْكَ بِقِطْعٍ مِّنَ

ہم تیرے رب کے بھیجے ہوئے فرشتے ہیں، یہ لوگ تیرا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔ بس تو کچھ رات رہے اپنے اہل و عیال کو لے کر نکل جا۔ اور دیکھو، تم میں سے کوئی شخص پیچھے پلٹ کرنہ دیکھے۔ [۸۹] مگر تیری یوں (ساتھ نہیں جائے گی) کیونکہ اس پر بھی وہی کچھ گزرنے والا ہے جو ان پر گزرنے ہے۔ [۹۰] ان کی تباہی کے لیے صحن کا وقت مقرر ہے۔ صحن ہوتے اب دیر ہی سکتی ہے!“ پھر جب ہمارے فیصلے کا وقت آپنچا تو ہم نے اس بستی کو تل پٹ کر دیا اور اس پر کپی ہوئی مٹی کے پھرتا بڑا توڑ برسائے [۹۱] جن میں سے ہر پھر تیرے رب کے ہاں نشان زدہ تھا۔ [۹۲] اور ظالموں سے یہ سزا کچھ دور نہیں ہے یہ [۹۳] اور مدین والوں کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیب کو بھیجا۔

[۸۹] مطلب یہ ہے کہ اب تم لوگوں کو بس یقین ہونی چاہیے کہ کسی طرح جلدی سے جلدی اس علاقے سے نکل جاؤ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ پیچھے شور اور دھماکوں کی آوازیں سن کر راستے میں ٹھیک جاؤ اور جور قبہ عذاب کے لیے نامزد کیا جا پکا ہے اس میں عذاب کا وقت آجائے کے بعد بھی تم میں سے کوئی رکارہ جائے۔

[۹۰] یہ تیراعبرت ناک واقعہ ہے جو اس سورۃ میں لوگوں کو یہ سبق دینے کے لیے بیان کیا گیا ہے کہ تم کو کسی بزرگ کی رشتہداری اور کسی بزرگ کی سفارش اپنے گناہوں کی پاداش سے نہیں بچا سکتی۔

[۹۱] غالباً یہ عذاب ایک سخت نازلے اور آتش فشاںی انجھار کی شکل میں آیا تھا۔ نازلے نے ان کی بستیوں کو تل پٹ کیا اور آتش فشاں مادے کے پھٹنے سے ان کے اوپر زور کا پھراؤ ہوا۔ پکی ہوئی مٹی کے پھتروں سے مراد شاید وہ مجرم ہی ہے جو آتش فشاں علاقے میں زیر میں حرارت اور لاوے کے اثر سے پھر کی شکل اعتیار کر لیتی ہے۔ آج تک جرلوٹ کے جنوب اور شرق کے علاقے میں اس انجھار کے آثار ہر طرف نمایاں ہیں۔

[۹۲] یعنی ہر چھر خدا کی طرف سے نامزد کیا ہوا تھا کہ اسے تباہ کاری کا کیا کام کرنا ہے اور کس پھر کو کس مجرم پر پڑنا ہے۔

[۹۳] یعنی آج جو لوگ ظلم کی اس روشن پر چل رہے ہیں وہ بھی اس عذاب کو اپنے سے دور نہ سمجھیں۔ عذاب اگر قوم اوت پر آسکت تھا تو ان پر بھی آسکتا ہے۔ خدا کو نہ لوٹ کی قوم عاجز کر سکی تھی، نہ یہ کہ سکتے ہیں۔

[۹۴] سورۃ اعراف، رکوع ۱۱ کے حوالی پیش نظر ہیں۔

شَعِيْبًا طَقَالَ يَقُومٌ اَعْبُدُ وَاَللَّهُ مَا لَكُمْ مِنْ إِلَهٌ غَيْرُهُ^{۶۹}
 وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكِيلَانَ وَالْمِيزَانَ اِنِّي آرِكُمْ بِخَيْرٍ
 وَإِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيطٍ ^{۷۰} وَيَقُومُ اُوْفُوا
 الْمِكِيلَانَ وَالْمِيزَانَ بِالْقُسْطِ وَلَا تَبْخُسُوا النَّاسَ اَشْيَاءَهُمْ
 وَلَا تَعْثُوا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِينَ ^{۷۱} بِقِيَّتِ اللَّهِ خَيْرُكُمْ
 اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ هَذِهِ مَا اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيظٍ ^{۷۲} قَالُوا
 يَا شَعِيْبَ اَصْلُوتُكَ تَأْمُرُنَّا اَنْ تَنْرُكَ مَا يَعْبُدُ اَبَا اُونَآ اَوْ

اُس نے کہا ”اے میری قوم کے لوگو، اللہ کی بنگی کرو، اس کے سواتھارا کوئی خدا نہیں ہے۔ اور ناپ توں میں کمی نہ کیا کرو۔ آج میں تم کو اچھے حال میں دیکھ رہا ہوں، مگر مجھے ڈر ہے کہ کل تم پر ایسا دن آئے گا جس کا عذاب سب کو گھیر لے گا۔ اور اے برادر ان قوم، ٹھیک ٹھیک انصاف کے ساتھ پورا ناپ اوڑ تو لو اور لوگوں کو ان کی چیزوں میں گھاثانہ دیا کرو اور زمین میں فساد نہ پھیلاتے پھرو۔ اللہ کی دی ہوئی بچت تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم مومن ہو۔ اور بہر حال میں تمہارے اوپر کوئی نگران کا نہیں ہوں۔“ ^[۹۵]

انہوں نے جواب دیا ”اے شعیب، کیا تیری نماز تجھے یہ سکھاتی ہے؟“ کہم ان سارے معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی پرستش ہمارے باپ دادا

[۹۵] یعنی میرا کوئی زور تم پہنیں ہے۔ میں تو اس ایک خیر خواہ ناصح ہوں۔ زیادہ سے زیادہ اتنا ہی کر سکتا ہوں کہ تمہیں سمجھا دوں۔ آگے تمہیں اختیار ہے، چاہے منو، چاہے نہ منو۔ سوال میری باز پرس سے ڈرنے یا نہ ڈرنے کا نہیں ہے۔ اصل چیز خدا کی باز پرس ہے جس کا اگر تمہیں کچھ خوف ہو تو اپنی ان حرکتوں سے باز آ جاؤ۔

[۹۶] یہ دراصل ایک طعن آمیز فقرہ ہے جس کی روح آج بھی آپ ہر اس سوسائٹی میں موجود پائیں گے جو خدا سے غافل اور فتن و فحور میں ڈوبی ہوئی ہو۔ چونکہ نماز دین داری کا سب سے پہلا اور سب سے زیادہ نمایاں مظہر ہے، اور دین داری کو فاسق و فاجر لوگ ایک خطرناک، بلکہ سب سے زیادہ خطرناک مرض سمجھتے ہیں، اس لیے نماز ایسے لوگوں کی سوسائٹی میں عبادت کے بجائے علامت مرض شمار ہوتی ہے۔ کسی شخص کو اپنے درمیان نماز پڑھتے دیکھ کر انہیں فوراً یا احساس ہو جاتا ہے کہ اس شخص پر ”مرض دین داری“ کا حملہ ہو گیا ہے۔ پھر یہ لوگ دین داری کی اس خاصیت کو بھی جانتے ہیں کہ یہ چیز جس شخص کے اندر پیدا ہو جاتی ہے وہ صرف اپنے حسن عمل پر قائم نہیں رہتا بلکہ دوسروں کو بھی درست کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور بے دینی و بد اخلاقی پر تقدیم کیے بغیر اس سے رہانہیں جاتا، اس لیے نماز پر ان کا اغطراب صرف اسی حیثیت سے نہیں ہوتا کہ ان کے ایک بھائی پر دین داری کا دورہ پڑ گیا ہے، بلکہ اس کے ساتھ ہی انہیں یہ کھلا بھی لگ

أَنْ تَفْعَلَ فِي أَمْوَالِنَا مَا نَشَاءُ إِنَّكَ لَا نُنْهِيُ الْحَلِيمُ الرَّشِيدُ^{۶۷}
 قَالَ يُقَوِّمُ أَرْءَى تُمُرٌ إِنْ كُنْتُ عَلَى بَيِّنَةٍ مِّنْ سَارِيٍّ وَ
 سَارَّ قَبْنِي مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا وَمَا أُرِيدُ أَنْ أُخَالِفَكُمْ إِلَى

کرت تھے؟ یا یہ کہ ہم کو اپنے مال میں اپنے منشا کے مطابق تصرف کرنے کا اختیار نہ ہو؟ [۶۸] بس تو ہی تو ایک
عالی طرف اور راست بازاً دی رہ گیا ہے!

شعبہ نے کہا ”بھائیو تم خود ہی سوچو کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک کھلی شہادت پر تھا اور پھر اس
نے مجھے اپنے ہاں سے اچھا رزق بھی عطا کیا“ [۶۹] (تو اس کے بعد میں تمہاری گمراہیوں اور حرام خوریوں میں
تمہارا شریک حال کیسے ہو سکتا ہوں)؟ اور میں ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ جن باتوں سے میں تم کو روکتا ہوں

جاتا ہے کہ اب غنقریب اخلاق و دیانت کا وعظ شروع ہونے والا ہے اور اجتماعی زندگی کے ہر پبلو میں کیڑے نکالنے کا ایک لامتناہی سلسلہ
چھڑا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسی سوسائٹی میں نماز سب سے بڑھ کر طعن و تشنج کی بد فہمی ہے۔ اور اگر کہیں نمازی آدمی ٹھیک ٹھیک
انہی اندریوں کے مطابق، جو اس کی نماز سے پہلے ہی پیدا ہو چکے تھے، برائیوں پر تقدیما اور بھائیوں کی تلقین بھی شروع کر دے، تب تو نماز
اس طرح کوئی جاتی ہے کہ گویا یہ ساری بلا اسی کی لائی ہوئی ہے۔

[۶۷] یہ اسلام کے مقابلہ میں جامیت کے نظریہ کی پوری ترجمانی ہے۔ اسلام کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اللہ کی بندگی کے سوا جو طریقہ
بھی ہے غلط ہے اور اس کی پیروی نہ کرنی چاہیے۔ کیونکہ دوسرے کسی طریقے کے لیے عقل، علم اور کتب آسمانی میں کوئی دلیل نہیں ہے۔ اور
یہ کہ اللہ کی بندگی صرف ایک محدود مذہبی دائرے ہی میں نہیں ہوئی چاہیے بلکہ تمدن، معاشرت، میعت، سیاست، غرض زندگی کے تمام
شعبوں میں ہوئی چاہیے۔ اس لیے کہ دنیا میں انسان کے پاس جو کچھ بھی ہے اللہ تھی کا ہے اور انسان کی چیز پر بھی اللہ کی مرضی سے آزاد
ہو کر خود مختار اور تصرف کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ اس کے مقابلہ میں جامیت کا نظریہ یہ ہے کہ باپ دادا سے جو طریقہ بھی چلا آ رہا ہو انسان کو
اس کی پیروی کرنی چاہیے اور اس کی پیروی کے لیے اس دلیل کے سوا کسی مزید دلیل کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ باپ دادا کا طریقہ ہے۔ نیز
یہ کہ دین و مذہب کا تعلق صرف پوچاپاٹ سے ہے، رہے ہماری زندگی کے عام دنیوی معاملات، تو ان میں ہم کو پوری آزادی ہوئی چاہیے
کہ جس طرح چاہیں کام کریں۔

[۶۸] رزق کا لفظ یہاں دو ہرے معنی دے رہا ہے۔ اس کے ایک معنی تو علم حق کے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بخشنا گیا ہو۔
اور دوسرے معنی وہی ہیں جو بالعموم اس لفظ سے سمجھے جاتے ہیں، یعنی وہ ذرائع جو زندگی برکرنے کے لیے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو دیتا
ہے۔ پہلے معنی کے لحاظ سے یہ آیت اسیضمون کو ادا کر رہی ہے جو اس سورے میں محمد ﷺ، نوح علیہ السلام اور صاحب علیہ السلام کی زبان
سے ادا ہوتا چلا آیا ہے کہ نبوت سے پہلے بھی میں اپنے رب کی طرف سے حق کی کھلی کھلی شہادت اپنے نفس میں اور کائنات کے آثار میں
پار با تھا، اور اس کے بعد میرے رب نے براہ راست علم حق بھی مجھے دے دیا۔ اب میرے لیے یہ کس طرح ممکن ہے کہ جان بوجھ کر ان

مَا أَنْهِكُمْ عَنْهُ طَإِنْ أُرِيدُ إِلَّا اِلْصَلَاحَ مَا أَسْطَعْتُ
وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ طَعَلَيْهِ تَوْكِلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ ۝
وَيَقُومُ لَا يَجِدُ مَنَّكُمْ شَقَاقيَّاً أَنْ يُصِيبَكُمْ مِثْلُ مَا أَصَابَ
قَوْمَ نُوحَ أَوْ قَوْمَ هُودَ أَوْ قَوْمَ صَلِحَ طَوْمَ قَوْمَ لُوطَ مِنْكُمْ
بَعِيْدٌ ۝ وَاسْتَغْفِرُ وَارْبَكُمْ ثُمَّ تُوْبُوا إِلَيْهِ طَإِنْ رَبِّيَّ

ان کا خود ارتکاب کروں۔ [۹۹] میں تو اصلاح کرنا چاہتا ہوں جہاں تک بھی میرا بس چلے۔ اور یہ جو کچھ میں کرنا چاہتا ہوں اس کا سارا انحصار اللہ کی توفیق پر ہے، اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور ہر معاملہ میں اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں۔ اور اے برادر ان قوم، میرے خلاف تمہاری ہٹ دھرمی کہیں یہ نوبت نہ پہنچادے کہ آخوندار تم پر بھی وہی عذاب آ کر رہے جو نوح یا ہود یا صالح کی قوم پر آیا تھا۔ اور لوٹ کی قوم تو تم سے کچھ زیادہ دور بھی نہیں ہے۔ [۱۰۰] دیکھو! اپنے رب سے معافی مانگو اور اس کی طرف پلٹ آؤ، بے شک میرا رب

گمراہیوں اور بد اخلاقیوں میں تمہارا ساتھ دوں جن میں تم بتلا ہو۔ اور دوسرے معنی کے لحاظ سے یہ آیت اُس طمعنے کا جواب ہے جو ان لوگوں نے حضرت معلیٰ کو دیا تھا کہ ”بس تم ہی تو ایک عالی ظرف اور راست بازاً دی رہ گئے ہو۔“ اس تند و ترش حملے کا یہ تھنڈا جواب دیا گیا ہے کہ بھائیو، اگر میرے رب نے مجھے حق شناس بصیرت بھی دی ہو اور رزق حلال بھی عطا کیا ہو تو آخر تمہارے طعنوں سے یہ فضل غیر فضل کیسے ہو جائے گا۔ آخر میرے لیے یہ کس طرح جائز ہو سکتا ہے کہ جب خدا نے مجھ پر یہ فضل کیا ہے تو میں تمہاری گمراہیوں اور حرام خوریوں کو حق اور حلال کہہ کر اس کی ناشکری کروں۔

[۹۹] یعنی میری سچائی کا تم اس بات سے اندازہ کر سکتے ہو کہ جو کچھ دوسروں سے کہتا ہوں اسی پر خود عمل کرتا ہوں۔ اگر میں تم کو غیر اللہ کے آستانوں سے روکتا اور خود کسی آستانے کا مجاور بن بیٹھا ہوتا تو بلاشبہ تم پر کہہ سکتے تھے کہ اپنی بیرونی چمکانے کے لیے دوسری دو کانوں کی ساکھ بگاڑنا چاہتا ہے۔ اگر میں تم کو حرام کے مال کھانے سے منع کرتا اور خود اپنے کاروبار میں بے ایمانیاں کر رہا ہوتا تو ضرور تم یہ شبہ کر سکتے تھے کہ میں اپنی ساکھ جمانے کے لیے ایمان داری کا ڈھول پیپٹ رہا ہوں۔ لیکن تم دیکھتے ہو کہ میں خود ان برائیوں سے بچتا ہوں جن سے تم کو منع کرتا ہوں۔ میری اپنی زندگی ان دھبوں سے پاک ہے جن سے تمہیں پاک دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں نے اپنے لیے بھی اسی طریقہ کو پسند کیا ہے جس کی تمہیں دعوت دے رہا ہوں۔ یہ چیز اس بات کی شہادت کے لیے کافی ہے کہ میں اپنی اس دعوت میں صادق ہوں۔

[۱۰۰] یعنی قوم لوٹ کا واقعہ تو ابھی تازہ ہی ہے اور تمہارے قریب ہی کے علاقے میں پیش آچکا ہے۔ غالباً اس وقت قوم لوٹ کی تباہی پر چھسات سورس سے زیادہ نگزیرے تھے۔ اور جغرافیٰ حیثیت سے بھی قوم شعیب کا ملک اس علاقے سے بالکل متصل واقع تھا جہاں قوم لوٹ رہتی تھی۔

رَحِيمٌ وَدُودٌ ۚ قَالُوا يُشْعِبُ مَا نَفَقَهُ كَثِيرًا إِمَّا تَقُولُونَ

رجیم ہے اور اپنی مخلوق سے محبت رکھتا ہے۔^[۱۰۱]

انہوں نے جواب دیا ”اے شعیب، تیری بہت سی باتیں تو ہماری سمجھتی ہی میں نہیں آتیں۔^[۱۰۲]

[۱۰۱] یعنی اللہ تعالیٰ سنگ دل اور بے رحم نہیں ہے۔ اس کو اپنی مخلوقات سے کوئی دشمنی نہیں ہے کہ خواہ مخواہ سزاد ہے یہی کو اس کا جی چاہے اور اپنے بندوں کو مار کر ہی وہ خوش ہو۔ تم لوگ اپنی شرکیوں میں جب حد سے گزرا جاتے ہو اور کسی طرف فساد پھیلانے سے بازی نہیں آتے تب وہ بادل ناخواستہ تھیں سزاد ہوتا ہے۔ ورنہ اس کا حال تو یہ ہے کہ تم خواہ کتنے ہی قصور کر چکے ہو، جب بھی اپنے افعال پر ناہم ہو کر اس کی طرف پٹھو گے اس کے دامن رحمت کو اپنے لیے سمع پاؤ گے۔ کیونکہ اپنی پیدا کی ہوئی مخلوق سے وہ بے پایاں محبت رکھتا ہے۔ اس مضمون کو نبی ﷺ نے دونہایت اطیف مثالوں سے واضح فرمایا ہے۔ ایک مثال تو آپ نے یہ دی ہے کہ اگر تم میں سے کسی شخص کا اونٹ ایک بے آب گیاہ صحراء میں کھو گیا ہو اور اس کے کھانے پینے کا سامان بھی اسی اونٹ پر ہوا وہ شخص اس کو ڈھونڈ کر یا اس ہو چکا ہو یہاں تک کہ زندگی سے بے آس ہو کر ایک درخت کے نیچے لیٹ گیا ہو، اور میں اس حالت میں یا کیا یک وہ دیکھے کہ اس کا اونٹ سامنے کھڑا ہے، تو اس وقت جیسی کچھ خوشی اس کو ہو گی، اس سے بہت زیادہ خوشی اللہ کو اپنے بھکے ہوئے بندے کے پلٹ آنے سے ہوتی ہے۔ دوسری مثال اس سے بھی زیادہ موثر ہے۔ حضرت عمرؓ نے یہی کہ ایک دفعہ نبی ﷺ کی خدمت میں کچھ جنگی قیدی گرفتار ہو کر آئے۔ ان میں ایک عورت بھی تھی جس کا شیر خوار بچہ چھوٹ گیا تھا اور وہ مامتا کی ماری ایسی بے چین تھی کہ جس بچے کو پالیتی اسے چھاتی سے چھنا کر دو دھپلے لگاتی تھی۔ نبی ﷺ نے اس کا حال دیکھ کر ہم لوگوں سے پوچھا کیا تم لوگ یہ موقع کر سکتے ہو کہ یہ ماں اپنے بچے کو خود اپنے ہاتھوں آگ میں پھینک دے گی؟ ہم نے عرض کیا ہرگز نہیں، خود پھینکنا تو درکار، وہ آپ گرتا ہو تو یہ اپنی حد تک اسے چھانے میں کوئی کسر اٹھانے رکھے گی۔ فرمایا: اللہ ارحم بعبادہ مِنْ هَذِهِ بُولَدَهَا۔ ”اللہ کا رحم اپنے بندوں پر اس سے بہت زیادہ ہے جو یہ عورت اپنے بچے کے لیے رکھتی ہے۔“

اور ویسے بھی غور کرنے سے یہ بات بخوبی سمجھ میں آسکتی ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ ہی تو ہے جس نے بچوں کی پرورش کے لیے ماں باپ کے دل میں محبت پیدا کی ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اگر خدا اس محبت کو پیدا نہ کرتا تو ماں اور باپ سے بڑھ کر بچوں کا کوئی دشمن نہ ہوتا۔ کیونکہ سب سے بڑھ کر وہ اپنی کے لیے تکلیف دہ ہوتے ہیں۔ اب ہر شخص خود سمجھ سکتا ہے کہ جو خدا محبت مادری اور شفقت پدری کا خالق ہے خود اس کے اندر اپنی مخلوق کے لیے کیسی کچھ محبت موجود ہو گی۔

[۱۰۲] یہ سمجھ میں نہ آنا کچھ اس بنا پر نہ تھا کہ حضرت شعیب کی غیر زبان میں کلام کرتے تھے، یا ان کی باتیں بہت مغلق اور یقیدہ ہوتی تھیں۔ باتیں تو سب صاف اور سیدھی ہی تھیں اور اسی زبان میں کی جاتی تھیں جو یہ لوگ بولتے تھے، لیکن ان کے ذہن کا سانچا اس قدر ٹیڑھا ہو چکا تھا کہ حضرت شعیب کی سیدھی باتیں کسی طرح اس میں نہ اتر سکتی تھیں۔ قاعدے کی بات ہے کہ جو لوگ تعصبات اور خواہش نفس کی بندگی میں شدت کے ساتھ مبتلا ہوتے ہیں اور کسی خاص طرز خیال پر جامد ہو چکے ہوتے ہیں، وہ اول تو کوئی ایسی بات سن ہی نہیں سکتے جو ان کے خیالات سے مختلف ہو، اور اگر سن بھی لیں تو ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کس دنیا کی باتیں کی جا رہی ہیں۔

وَإِنَّا لَنَرَيْكَ فِينَا ضَعِيفًا ۝ وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنَكَ ذَوَماً
أَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيزٍ ۚ ۹۱ قَالَ يَقُومُ أَرَهْطِيَّ أَعْزُزُ عَلَيْكُمْ مِنَ
اللَّهِ طَ وَاتَّخَذْتُمُوهُ وَرَأَءَ كُمْ ظَهِيرَيَا طِ اِنَّ رَزِّيَّ بِهَا تَعْمَلُونَ
مُحِيطٌ ۚ ۹۲ وَيَقُومُ اعْمَلُوا عَلَى مَكَانَتِكُمْ رَازِّيَّ عَاصِلٌ سَوْفَ
تَعْلَمُونَ لَمَنْ يَأْتِيَهُ عَذَابٌ يُخْزِيَهُ وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ طَ
وَارْتَقِبُوا إِنِّي مَعَكُمْ رَقِيبٌ ۚ ۹۳ وَلَمَّا جَاءَ أَمْرُنَا نَجَّيْنَا
شَعِيبًا وَالَّذِينَ أَمْنَوْا مَعَهُ بِرَحْمَةِ مَنَّا وَأَخْدَدَتِ الَّذِينَ
ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاصْبَحُوا فِي دِيَارِهِمْ جَثِيمِينَ ۚ ۹۴ كَانُ لَمْ
يَعْنُوا فِيهَا طَ اَلَا بُعْدًا الْمَدِينَ كَمَا بَعِدَتْ شَمُودُ ۙ ۹۵

اور ہم دیکھتے ہیں کہ تو ہمارے درمیان ایک بے زور آدمی ہے، تیری برادری نہ ہوتی تو ہم کبھی کا تجھے سنگار کر چکے ہوتے، تیرا بل بوتا تو انہیں ہے کہ ہم پر بھاری ہو۔ [۱۰۳] شعیب نے کہا ”بھائیو، کیا میری برادری تم پر اللہ سے زیادہ بھاری ہے کہ تم نے (برادری کا تو خوف کیا اور) اللہ کو بالکل پس پشت ڈال دیا؟ جان رکھو کہ جو کچھ تم کر رہے ہو وہ اللہ کی گرفت سے باہر نہیں ہے۔ اے میری قوم کے لوگوں، تم اپنے طریقے پر کام کیے جاؤ اور میں اپنے طریقے پر کرتا رہوں گا، جلدی ہی تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کس پر ذات کا عذاب آتا ہے اور کون جھوٹا ہے۔ تم بھی انتظار کرو اور میں بھی تمہارے ساتھ چشم براہ ہوں۔“

آخر کار جب ہمارے فیصلے کا وقت آگیا تو ہم نے اپنی رحمت سے شعیب اور اس کے ساتھی مومنوں کو بچایا اور جن لوگوں نے ظلم کیا تھا ان کو ایک سخت دھماکے نے ایسا کپڑا کہ وہ اپنی بستیوں میں بے حس و حرکت پڑے کے پڑے رہ گئے کویا وہ کبھی وہاں رہے بے ہی نہ تھے۔ سنو! مدین والے بھی دور پھینک دیے گئے جس طرح شمود پھینکے گئے تھے یہ

[۱۰۴] یہ بات پیش نظر رہے کہ یعنیہ یہی صورت حال ان آیات کے نزول کے وقت میں درپیش تھی۔ اس وقت قریش کے لوگ بھی اسی طرح محمد ﷺ کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے اور چاہتے تھے کہ آپ کی زندگی کا خاتمہ کر دیں۔ لیکن صرف اس وجہ سے آپ پر ہاتھ ڈالتے ہوئے ڈرتے تھے کہ بنی ہاشم آپ کی پشت پر تھے۔ پس حضرت شعیب اور ان کی قوم کا یہ قصہ ٹھیک قریش اور محمد ﷺ کے معاملہ پر چیل کرتے ہوئے بیان کیا جا رہا ہے، اور آگے حضرت شعیب کا جواب اپنی سبق آموز جواب نقل کیا گیا ہے اس کے اندر یہ معنی پوشیدہ ہیں کہ اے قریش کے لوگوں، تم کوئی محمدؐ کی طرف سے یہی جواب ہے۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِاِلْيَتِنَا وَسُلْطَنٌ مُّبِينٌ ۝ إِلَىٰ فَرْعَوْنَ
وَمَلَأْنِيهِ قَاتِبَعُوْا اَمْرَ فَرْعَوْنَ ۝ وَمَا اَمْرُ فَرْعَوْنَ بِرَشِيدٍ ۝
يَقْدُرُ قَوْمَهُ يَوْمَ الْقِيمَةِ ۝ فَآوْرَدُهُمُ النَّارَ ۝ وَبِئْسَ الْوِرْدُ
الْمُوْرُودُ ۝ وَأَتَيْعُوْا فِي هُذِهِ لَعْنَةَ ۝ وَيَوْمَ الْقِيمَةِ طِبْسَ
الرِّفْدُ الْمَرْفُودُ ۝ ذَلِكَ مِنْ آنِبَاءِ الْقُرْآنِ نَقْصَهُ عَلَيْكَ
مِنْهَا قَائِمٌ وَحَصِيدٌ ۝ وَمَا ظَلَمْنَاهُمْ وَلِكُنْ ظَلَمُوا اَنفُسَهُمْ

اور موسیٰ کو ہم نے اپنی نشانیوں اور کھلی سند ماموریت کے ساتھ فرعون اور اس کے اعیان سلطنت کی طرف بھیجا، مگر انہوں نے فرعون کے حکم کی پیروی کی، حالانکہ فرعون کا حکم راستی پر نہ تھا۔ قیامت کے روز وہ اپنی قوم کے آگے آگے ہو گا اور اپنی پیشوائی میں انھیں دوزخ کی طرف لے جائے گا۔ [۱۰۲] کیسی بدتر جائے ڈرود ہے یہ جس پر کوئی پہنچے! اور ان لوگوں پر دنیا میں بھی لعنت پڑی اور قیامت کے روز بھی پڑے گی۔ کیسا برا صدھ ہے یہ جو کسی کو ملے! یہ چند بستیوں کی سرگزشت ہے جو ہم تمہیں سنارہے ہیں۔ ان میں سے بعض اب بھی کھڑی ہیں اور بعض کی فصل کٹ بچی ہے۔ ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا، انہوں نے آپ ہی اپنے اوپرستم ڈھایا۔

[۱۰۳] اس آیت سے اور قرآن مجید کی بعض دوسری تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ دنیا میں کسی قوم یا جماعت کے رہنماء ہوتے ہیں وہی قیامت کے روز بھی اس کے رہنماء ہوں گے۔ اگر وہ دنیا میں یعنی اور سچائی اور حق کی طرف رہنمائی کرتے ہیں تو جن لوگوں نے یہاں ان کی پیروی کی ہے وہ قیامت کے روز بھی انہی کے جھنڈے تے جمع ہوں گے اور ان کی پیشوائی میں جنت کی طرف جائیں گے۔ اور اگر وہ دنیا میں کسی ضلالت، کسی بداخلاتی یا کسی ایسی راہ کی طرف لوگوں کو بلاستے ہیں جو دین حق کی راہ نہیں ہے، تو جو لوگ یہاں ان کے پیچھے چل رہے ہیں وہ وہاں بھی ان کے پیچھے ہوں گے اور انہی کی سرکردگی میں جہنم کا رخ کریں گے۔ اسی مضمون کی ترجمانی نبی ﷺ کے اس ارشاد میں پائی جاتی ہے کہ امروء القیس حامل لواء شعراء الجاهلية الی النار، ”قیامت کے روز جاہلیت کی شاعری کا جھنڈا امروء القیس کے ہاتھ میں ہو گا اور عرب جاہلیت کے تمام شعراء اسی کی پیشوائی میں دوزخ کی راہ لیں گے۔“ اب یہ منظر ہر شخص کا اپنا خیل اس کی آنکھوں کے سامنے کھینچ سکتا ہے کہ یہ دونوں قسم کے جلوس کس شان سے اپنی منزل مقصدوں کی طرف جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ جن لیڈروں نے دنیا میں لوگوں کو گراہ کیا اور خلاف حق را ہوں پر چلا یا ہے ان کے پیروجب اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ یہ ظالم ہم کو کس خوف ناک انعام کی طرف کھینچ لائے ہیں، تو وہ اپنی ساری مصیتوں کا ذمہ دار انہی کو کبھیں گے اور ان کا جلوس اس شان سے دوزخ کی راہ پر رواں ہو گا کہ آگے آگے وہ ہوں گے اور پیچھے پیچھے ان کے پیروں کا ہجوم ان کو گالیاں دیتا ہوا اور ان پر لعنتوں کی بوچھاڑ کرتا ہوا جا رہا ہو گا۔ بخلاف اس کے جن لوگوں کی رہنمائی نے لوگوں کو جنت نعم کا مستحق بنایا ہو گا ان کے پیروانہا یہ انعام خیر دیکھ کر اپنے لیڈروں کو دعا میں دیتے ہوئے اور ان پر مدح و تحسین کے پھول بر ساتے ہوئے چلیں گے۔

فَلَمَّا آغْنَتْ عَنْهُمُ الْهَمْمُ الَّتِي يَدْعُونَ مِنْ دُوْنِ اللَّهِ مِنْ
شَيْءٍ لَّهَا جَاءَ أَمْرُ رَبِّكَ وَمَا زَادُوهُمْ غَيْرَ تَتْبِيبٍ ۝ وَكَذَلِكَ
أَخْدُرَ رَبِّكَ إِذَا أَخْدَى الْقُرْبَى وَهِيَ ظَالِمَةٌ ۝ إِنَّ أَخْدَى كَآلِيمٌ
شَدِيدٍ ۝ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَذِيَّةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْآخِرَةِ

اور جب اللہ کا حکم آگیا تو ان کے وہ معبد جنہیں وہ اللہ کو چھوڑ کر پا کرتے تھے ان کے کچھ کام نہ آسکے اور انہوں نے
ہلاکت و بر بادی کے سوا انھیں کچھ فائدہ نہ دیا۔ اور تیرارب جب کسی ظالم بنتی کو پکڑتا ہے تو پھر اس کی پکڑائی ہی ہوا
کرتی ہے، فی الواقع اس کی پکڑ بڑی سخت اور دردناک ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس میں ایک نشانی ہے ہر اس شخص
کے لیے جو عذاب آخرت کا خوف کرے۔ [۱۰۵]

[۱۰۵] یعنی تاریخ کے ان واقعات میں ایک ایسی نشانی ہے جس پر اگر انسان غور کرے تو اسے یقین آجائے گا کہ عذاب آخرت
ضرور پیش آنے والا ہے اور اس کے متعلق پیغمبروں کی دی ہوئی خبر بھی ہے۔ نیز اسی نشانی سے وہ یہ بھی معلوم کر سکتا ہے کہ عذاب آخرت
کیسا سخت ہو گا اور یہ علم اس کے دل میں خوف پیدا کر کے اسے سیدھا کرے گا۔

اب رہی یہ بات کہ تاریخ میں وہ کیا چیز ہے جو آخوند اور اس کے عذاب کی علامت کی جاسکتی ہے، تو ہر وہ شخص اسے آسانی سمجھ
سکتا ہے جو تاریخ کو محض واقعات کا مجموعہ ہی نہ سمجھتا ہو بلکہ ان واقعات کی منطق پر بھی کچھ غور کرتا ہو اور ان سے متاثر بھی اخذ کرنے کا
عادی ہو۔ ہزار ہا برس کی انسانی تاریخ میں قوموں اور جماعتوں کا لختنا اور گرنا جس تسلسل اور باضابطگی کے ساتھ رونما ہوتا ہے، اور پھر
اس گرنے اور اٹھنے میں جس طرح صریحاً کچھ اخلاقی اسباب کا فرمार ہے ہیں، اور گرنے والی قومیں جیسی جیسی عبرت انگیز صورتوں سے
گری ہیں، یہ سب کچھ اس حقیقت کی طرف کھلا اشارہ ہے کہ انسان اس کائنات میں ایک ایسی حکومت کا حکوم ہے جو شخص اندھے طبعیتی
توانیں پر فرمائیں کر رہی ہے، بلکہ اپنا ایک معقول اخلاقی قانون رکھتی ہے جس کے مطابق وہ اخلاق کی ایک خاص حد سے اور
رہنمے والوں کو جزو ایتی ہے، اس سے نیچے اترنے والوں کو کچھ مدت تک ڈھیل دیتی رہتی ہے، اور جب وہ اس سے بہت زیادہ نیچے چلے
جاتے ہیں تو پھر انھیں گرا کر ایسا پھیکتی ہے کہ وہ ایک داستان عبرت بن کر رہ جاتے ہیں۔ ان واقعات کا ہمیشہ ایک ترتیب کے ساتھ رونما
ہوتے رہنا اس امر میں شبہ کرنے کی ذرہ برابر گنجائیں نہیں چھوڑتا کہ جزا اور مكافات اس سلطنت کائنات کا ایک مستقل قانون ہے۔

پھر جو عذاب مختلف قوموں پر آئے ہیں ان پر مزید غور کرنے سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ از روئے انصاف قانون جزا مكافات
کے جو اخلاقی تقاضے ہیں وہ ایک حد تک تو ان عذابوں سے ضرور پورے ہوئے ہیں مگر بہت بڑی حد تک ابھی تشنہ ہیں۔ کیونکہ دنیا میں جو
عذاب آیا اس نے صرف اس تسلی کو پکڑا جو عذاب کے وقت موجود تھی۔ رہیں وہ تسلیں جو شرارتوں کے بیچ بکرا اور ظلم و بد کاری کی فصلیں
تیار کر کے کٹائی سے پہلے ہی دنیا سے رخصت ہو چکی تھیں اور جن کے کرتو توں کا خمیازہ بعد کی نسلوں کو بھلتنا پڑا، وہ تو گویا قانون مكافات
کے عمل سے صاف ہی قائم نکلی ہیں۔ اب اگر ہم تاریخ کے مطالعہ سے سلطنت کائنات کے مزاج کو ٹھیک سمجھ چکے ہیں تو ہمارا یہ مطالعہ
ہی اس بات کی شہادت دینے کے لیے کافی ہے کہ عقل اور انصاف کی رو سے قانون مكافات کے جو اخلاقی تقاضے ابھی تشنہ ہیں، ان کو پورا

ذلک یوْمَ مَجْمُوعٍ لَّهُ النَّاسُ وَذلِكَ يَوْمٌ مَّسْهُودٌ ۝ وَمَا
نُؤْخِرُهُ إِلَّا لِأَجْلٍ مَّعْدُودٍ ۝ يَوْمَ يَاتِ لَا تَكُونُ نَفْسٌ إِلَّا
يَادُنَّهُ ۝ فِيهِمْ شَقِيقٌ وَسَعِيدٌ ۝ فَآمَّا الَّذِينَ شَقَوْا فِي النَّارِ
لَهُمْ فِيهَا رَزْفِيرٌ وَشَهِيقٌ ۝ خَلِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمَوَاتُ
وَالْأَرْضُ إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ فَعَالٌ لِمَا يُرِيدُ ۝ وَ
آمَّا الَّذِينَ سُعِدُوا فِي الْجَنَّةِ خَلِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ

وہ ایک دن ہوگا جس میں سب لوگ جمع ہوں گے اور پھر جو کچھ بھی اس روز ہو گا سب کی آنکھوں کے سامنے ہو گا۔ ہم اس کے لانے میں کچھ بہت زیادہ تاخیر نہیں کر رہے ہیں، بس ایک گنی چنی مدت اس کے لیے مقرر ہے۔ جب وہ آئے گا تو کسی کو بات کرنے کی مجال نہ ہوگی، الایہ کہ خدا کی اجازت سے کچھ عرض کرے۔ [۱۰۲] پھر کچھ لوگ اس روز بد بخت ہوں گے اور کچھ نیک بخت۔ جو بد بخت ہوں گے وہ دوزخ میں جائیں گے (جہاں گرمی اور پیاس کی شدت سے) وہ ہانپیس گے اور پھنکا رے ماریں گے اور اسی حالت میں وہ ہمیشہ رہیں گے جب تک کہ زمین و آسمان قائم ہیں، [۱۰۳] الایہ کہ تیرارب کچھ اور چاہے۔ بے شک تیرارب پورا اختیار رکھتا ہے کہ جو چاہے کرے۔ [۱۰۴] رہے وہ لوگ جو نیک بخت نکلیں گے، توہ جنت میں جائیں گے اور وہاں ہمیشہ رہیں گے جب تک

کرنے کے لیے یہ عادل سلطنت یقیناً پھر ایک دوسرا عالم برپا کرے گی اور وہاں تمام خالموں کو ان کے کرتو توں کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور وہ بدلہ دنیا کے ان عذابوں سے بھی زیادہ سخت ہو گا۔ (ملاحظہ سورہ اعراف، حاشیہ ۳۰ و سورہ یوس، حاشیہ ۱۰)

[۱۰۵] یعنی یہ بے وقوف لوگ اپنی جگہ اس بھروسے میں ہیں کہ فلاں حضرت ہماری سفارش کر کے ہمیں بچالیں گے، اور ان کی بات نہ لائی جائے گی۔ حالاں کہ اللہ تعالیٰ کی پر حلال عدالت میں تو کسی بڑے سے بڑے انسان اور کسی معزز سے معزز فرشتے کو بھی مجال دم زدن تک نہ ہوگی اور اگر کوئی کچھ کہہ بھی سکے گا تو اس وقت جب کہ حکم الہا کمین خود سے کچھ عرض کرنے کی اجازت دیدے۔ پس جو لوگ اپنے خود ساختہ معبودوں کی شفاعت پر تکریے کیے بیٹھے ہیں انھیں وہاں سخت مایوسی سے دوچار ہونا پڑے گا۔

[۱۰۶] ان الفاظ سے یا تو عالم آخرت کے زمین و آسمان مراد ہیں، یا پھر محض محاورے کے طور پر ان کو دوام اور یعنیکی کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ بہر حال موجودہ زمین و آسمان تو مراد نہیں ہو سکتے، کیونکہ قرآن کے بیان کی رو سے یہ قیامت کے روز بدل ڈالے جائیں گے اور یہاں جن واقعات کا ذکر ہو رہا ہے وہ قیامت کے بعد پیش آنے والے ہیں۔

[۱۰۷] یعنی کوئی اور طاقت تو ایسی ہے جی نہیں جوان لوگوں کو اس دلکشی عذب سے بچا سکے۔ البتہ اگر اللہ تعالیٰ خود ہی کسی کے انعام کو بدلنا چاہے یا کسی کو یعنیکی کا عذاب دینے کے بجائے ایک مدت تک عذاب دے کر معاف کر دینے کا فیصلہ فرمائے تو اسے ایسا کرنے کا پورا اختیار ہے، کیونکہ اپنے قانون کا وہ خود ہی واضح ہے، کوئی بالاتر قانون ایسا نہیں ہے جو اس کے اختیارات کو محدود کرتا ہو۔

السَّمَوَاتُ وَالْأَرْضُ إِلَامَا شَاءَ رَبِّكَ عَطَاءً غَيْرَ مَجْدُودٍ
 فَلَا تَكُنْ فِي مِرْيَةٍ مِمَّا يَعْبُدُ هَوْلَاءُ طَمَّا يَعْبُدُونَ إِلَّا كُمَا
 يَعْبُدُ أَبَا وَهُمْ مِنْ قَبْلٍ طَوَّافُهُمْ نَصِيبُهُمْ غَيْرَ
 مَنْقُوْصٍ ۝ وَلَقَدْ أَتَيْنَا مُوسَى الْكِتَبَ فَاخْتَلَفَ فِيهِ طَ
 وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ وَإِنَّهُ لَفِي شَيْءٍ

زمیں و آسمان قائم ہیں، ایسا یہ کہ تیرارب کچھ اور چاہے۔ [۱۰۹] ایسی بخشش ان کو ملے گی جس کا سلسلہ کبھی منقطع نہ ہوگا۔ پس اے نبی، تو ان معبودوں کی طرف سے کسی شک میں نہ رہ جن کی یہ لوگ عبادت کر رہے ہیں۔ یہ تو (بس لکیر کے فقیر بنے ہوئے) اُسی طرح پوچھا پاٹ کیے جا رہے ہیں جس طرح پہلے ان کے باپ دادا کرتے تھے، [۱۱۰] اور ہم ان کا حصہ انھیں بھر پور دیں گے بغیر اس کے کہ اس میں کچھ کاٹ کر ہوئے ہم اس سے پہلے موسیٰ کو بھی کتاب دے چکے ہیں اور اس کے بارے میں بھی اختلاف کیا گیا تھا (جس طرح آج اس کتاب کے بارے میں کیا جا رہا ہے جو تمہیں دی گئی ہے) [۱۱۱]۔ اگر تیرے رب کی طرف سے ایک بات پہلے ہی طے نہ کردی گئی ہوتی تو ان اختلاف کرنے والوں کے درمیان کبھی کافیصلہ چکا دیا گیا ہوتا۔ [۱۱۲] یہ واقعہ ہے کہ یہ لوگ اس کی طرف سے شک اور

[۱۱۳] یعنی ان کا جنت میں ٹھیرنا بھی کسی ایسے بالآخر قانون پر بنی نہیں ہے جس نے اللہ کو ایسا کرنے پر مجبور کر رکھا ہو۔ بلکہ یہ سراسر اللہ کی عنایت ہو گی کہ وہ ان کو وہاں رکھے گا۔ اگر وہ ان کی قسمت بھی بدلتا چاہے تو اسے بدلنے کا پورا اختیار حاصل ہے۔

[۱۱۴] اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ نبی ﷺ واقعی ان معبودوں کی طرف سے کسی شک میں تھے، بلکہ دراصل یہ با تین نبی ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے عامۃ الناس کو سنائی جا رہی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ کسی مرد معقول کو اس شک میں نہ رہنا چاہیے کہ یہ لوگ جوان معبودوں کی پرستش کرنے اور ان سے دعا کیں مانگنے میں لگے ہوئے ہیں تو آخر کچھ تو انہوں نے دیکھا ہوگا جس کی وجہ سے یہ ان سے نفع کی امیدیں رکھتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ پرستش اور نذریں اور دعا کیں کسی علم، کسی تجربے اور کسی حقیقی مشاہدے کی بنا پر نہیں ہیں، بلکہ یہ سب کچھ زری انہی تقلید کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ آخر یہی آستانے پچھلی قوموں کے ہاں بھی تو موجود تھے۔ اور ایسی ہی ان کی کراتیں ان میں بھی مشہور تھیں۔ مگر جب خدا کا عذاب آیا تو وہ بتاہ ہو گئیں اور یہ آستانے یونہی دھرے کے درہ رہ گئے۔

[۱۱۵] یعنی یہ کوئی نئی بات نہیں ہے کہ آج اس قرآن کے بارے میں مختلف لوگ مختلف قسم کی چمگوئیاں کر رہے ہیں، بلکہ اس سے پہلے جب موسیٰ علیہ السلام کو کتاب میں تھی تو اس کے بارے میں بھی ایسی ہی مختلف رائے زیادتی کی گئی تھیں، لہذا اے محمد، تم یہ کیکر بدول اور شکست خاطر نہ ہو کہ ایسی سیدھی سیدھی اور صاف باتیں قرآن میں پیش کی جا رہی ہیں اور پھر بھی لوگ ان کو قبول نہیں کرتے۔

[۱۱۶] یہ فقرہ بھی نبی ﷺ اور اہل ایمان کو مطمئن کرنے اور صبر دلانے کے لیے فرمایا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم اس بات کے لیے بے چین نہ ہو کہ جو لوگ اس قرآن کے بارے میں اختلافات کر رہے ہیں ان کا فیصلہ جلدی سے چکا دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ پہلے ہی یہ

۱۱۵ منْهُ مُرِيْبٌ ۝ وَإِنَّ كُلَّا لَتَّا لَيُوقَّيْهُمْ رَبُّكَ أَعْمَالَهُمْ
إِنَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ حَسِيرٌ ۝ فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ
مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا إِنَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝ وَلَا تَرْكُنُوا إِلَى
الَّذِينَ ظَلَمُوا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ
أَوْلَيَاءَ ثُمَّ لَا تَنْصُرُونَ ۝ وَأَقِمِ الصَّلَاةَ طَرَفِ النَّهَارِ وَزُلْفًا
مِنَ الَّيْلِ ۝ إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُدْبِرُنَ السَّيِّئَاتِ ۝ ذَلِكَ ذِكْرٌ
لِلَّهِ كَرِيْمٌ ۝ وَاصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيْعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ۝

خلجان میں پڑے ہوئے ہیں اور یہ بھی واقع ہے کہ تیرارب انھیں ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دے کر رہے گا، یقیناً وہ ان کی سب حرکتوں سے باخبر ہے۔ پس اے نبی، تم، اور تمہارے وہ ساتھی جو (کفر و بغاوت سے ایمان و طاعت کی طرف) پلٹ آئے ہیں، ٹھیک ٹھیک راہ راست پر ثابت قدم رہو جیسا کہ تمہیں حکم دیا گیا ہے۔ اور بندگی کی حد سے تجاوز نہ کرو۔ جو کچھ تم کر رہے ہو اس پر تمہارا راب نگاہ رکھتا ہے۔ ان ظالموں کی طرف ذرا نہ جھکنا اور نہ جہنم کی پیٹ میں آجائے گے اور تمہیں کوئی ایسا ولی و سر پرست نہ ملے گا جو خدا سے تمہیں بچا سکے اور کہیں سے تم کو مدد نہ پہنچے گی۔ اور دیکھو، نماز قائم کر وہن کے دونوں سروں پر اور کچھ رات گزرنے پر۔ [۱۱۳] درحقیقت نیکیاں برا کیوں کو دور کر دیتی ہیں، [۱۱۴] یہ ایک یاد دہانی ہے ان لوگوں کے لیے جو خدا کو یاد رکھنے والے ہیں۔ اور صبر کر، اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر بھی ضائع نہیں کرتا۔

ٹے کرچکا ہے کہ فیصلہ وقت مقرر سے پہلے نہ کیا جائے گا، اور یہ کہ دنیا کے لوگ فیصلہ چاہنے میں جو جلد بازی کرتے ہیں، اللہ فیصلہ کر دینے میں وہ جلد بازی نہ کرے گا۔

[۱۱۳] دن کے دونوں سروں پر سے مراد صحیح اور مغرب ہے، اور کچھ رات گزرنے پر سے مراد عشاء کا وقت ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ ارشاد اس زمانے کا ہے جب دنیا کے لیے ابھی پاچ وقت مقرر نہیں کیے گئے تھے۔ معراج کا واقعہ اس کے بعد پیش آیا جس میں پنج وقت نماز فرض ہوئی۔ (نماز کے اوقات کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہونی اسرائیل، حاشیہ ۹۵۔ طہ، حاشیہ ۱۱۱ اور الروم، حاشیہ ۱۲۲)

[۱۱۴] یعنی جو برائیاں دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں اور جو برائیاں تمہارے ساتھ اس دعوت حق کی دشمنی میں کی جا رہی ہیں، ان سب کو دفع کرنے کا اصل طریقہ یہ ہے کہ تم خود زیادہ سے زیادہ نیک بنو اور اپنی یتیمی سے اس بدی کو نکالتے دو، اور تم کو نیک بنانے کا بہترین ذریعہ یہ نماز ہے جو تم میں وہ اوصاف پیدا کرے گی جن سے بدی کے اس مظہم طوفان کا نہ صرف مقابلہ کر سکو گے بلکہ اسے دفع کر کے دنیا میں عملی خیر و صلاح کا نظام بھی قائم کر سکو گے۔

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُونِ مِنْ قَبْلِكُمْ أَوْلُوْا بَقِيَّةً يَنْهَوْنَ
عَنِ الْفَسَادِ فِي الْأَرْضِ إِلَّا قَلِيلًا مِمَّنْ أَنْجَيْنَا مِنْهُمْ وَاتَّبَعَ
الَّذِينَ ظَلَمُوا مَمَّا أَتَرْفُوا فِيهِ وَكَانُوا مُجْرِمِينَ ۝ وَمَا
كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرْىٰ بِطُلْجٍ وَآهُلُهَا مُصلِحُونَ ۝

پھر کیوں نہ ان قوموں میں جو تم سے پہلے گزر چکی ہیں ایسے اہل خیر موجود ہے جو لوگوں کو زمین میں فساد برپا کرنے سے روکتے؟ ایسے لوگ نکلے بھی تو بہت کم، جن کو ہم نے ان قوموں میں سے بچایا، ورنہ ظالم لوگ تو انہی مزدوں کے پیچھے پڑے رہے جن کے سامان انھیں فراوانی کے ساتھ دیے گئے تھے اور وہ مجرم بن کر رہے۔ تیرا رب ایسا نہیں ہے کہ بتیوں کو ناحق تباہ کر دے حالانکہ ان کے باشندے اصلاح کرنے والے ہوں۔ [۱۱۵]

[۱۱۵] ان آیات میں {عذاب کی گرفت میں آنے والی قوموں کے حالات} پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا جاتا ہے کہ پچھلی انسانی تاریخ میں جتنی قومیں بھی جاہ ہوئی ہیں ان سب کو جس چیز نے گرایا وہ یہ تھی کہ جب اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی نعمتوں سے سفر ازا کیا تو وہ خوش حالی کے نشے میں مست ہو کر زمین میں فساد برپا کرنے لگیں اور ان کا اجتماعی خیر اس درجہ بگزگیا کہ یا تو ان کے اندر رائیے نیک لوگ باقی رہے ہی نہیں جو ان کو برائیوں سے روکتے، یا اگر کچھ لوگ ایسے نکلے بھی تو وہ اتنے کم تھے اور ان کی آوازاتی کمزور تھی کہ ان کے روکنے سے فساد نہ رک سکا۔ یہی چیز ہے جس کی بدولت آخر کار یہ قومیں اللہ تعالیٰ کے غصب کی مستحق ہوئیں، ورنہ اللہ کو اپنے بندوں سے کوئی دشمنی نہیں ہے کہ وہ تو بھل کام کر رہے ہوں اور اللہ ان کو خواہ مخواہ عذاب میں بٹلا کر دے۔ اس ارشاد سے یہاں تین باتیں ذہن نشین کرنی مقصود ہیں:

ایک یہ کہ ہر اجتماعی نظام میں ایسے نیک لوگوں کا موجود رہنا ضروری ہے جو خیر کی دعوت دینے والے اور شر سے روکنے والے ہوں۔ اس لیے کہ خیر ہی وہ چیز ہے جو اصل میں اللہ کو مطلوب ہے، اور لوگوں کے شر و کو اللہ برداشت کرتا بھی ہے تو اس خیر کی خاطر کرتا ہے جو ان کے اندر موجود ہو، اور اسی وقت تک کرتا ہے جب تک ان کے اندر خیر کا امکان باقی رہے۔ مگر جب کوئی انسانی گروہ اہل خیر سے خالی ہو جائے اور اس میں صرف شریلوگ ہی باقی رہ جائیں، یا اہل خیر موجود ہوں بھی تو کوئی ان کی کن کرندے اور پوری قوم کی قوم اخلاقی فساد کی راہ پر بڑھتی چلی جائے، تو پھر خدا کا عذاب اس کے سر پر اس طرح منڈلانے لگتا ہے جیسے پورے دنوں کی حاملہ کہ پچھلے نہیں کہہ سکتے کب اس کا وضع محل ہو جائے۔

دوسرے یہ کہ جو قوم اپنے درمیان ایسے لوگوں کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہ ہو جاؤ سے برائیوں سے روکتے اور بھلاکیوں کی دعوت دیتے ہوں، تو سمجھ لو کہ اس کے برے دن قریب آگئے ہیں، کیونکہ وہ خود ہی اپنی جان کی دشمن ہو گئی ہے۔

تیسرا یہ کہ ایک قوم کے بٹلائے عذاب ہونے یا نہ ہونے کا آخری فیصلہ جس چیز پر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اس میں دعوت خیر پر لبیک کہنے والے عناصر کس حد تک موجود ہیں۔ اگر اس کے اندر ایسے افراد اتنی تعداد میں نکل آئیں جو فاد کو منانے اور نظام صالح کو قائم کرنے کے لیے کافی ہو تو اس پر عذاب عام نہیں بھیجا جاتا بلکہ ان صالح عناصر کو اصلاح حال کا موقع دیا جاتا ہے۔ لیکن اگر پیغمبر سعی و جهد

وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَا يَرَوْنَ
مُحْتَلِفِينَ ۝ إِلَّا مَنْ رَحْمَ رَبُّكَ طَوْلَذِلَكَ خَلْقَهُمْ وَتَمَتَّعَلْمَهُ
رَبُّكَ لَأَمْئَنَ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسُ أَجْمَعِينَ ۝ وَكُلًا
نَقْصٌ عَلَيْكَ مِنْ أَنْبِاءِ الرَّسُولِ مَا نَثَبَتْ بِهِ فُؤَادُكَ وَجَاءَكَ
فِي هَذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَذِكْرًا لِلْمُهُومِينَ ۝ وَقُلْ لِلنَّاسِ

بے شک تیراب اگر چاہتا تو تمام انسانوں کو ایک گروہ بنا سکتا تھا، مگر اب تو وہ مختلف طریقوں ہی پر چلتے رہیں گے اور بے راہ رو یوں سے صرف وہ لوگ بچیں گے جن پر تیرے رب کی رحمت ہے۔ اسی (آزادی انتخاب و اختیار اور امتحان) کے لیے تو اس نے انھیں پیدا کیا تھا۔ [۱۱۸] اور تیرے رب کی وہ بات پوری ہو گئی جو اس نے کہی تھی کہ میں جہنم کو جنوں اور انسانوں، سب سے بھر دوں گا۔ اور اے نبی، یہ بغیر بول کے قصہ جو ہم تمہیں سناتے ہیں، یہ وہ چیزیں ہیں جن کے ذریعہ سے ہم تمہارے دل کو مضبوط کرتے ہیں۔ ان کے اندر تم کو حقیقت کا علم ملا اور ایمان لانے والوں کو نصیحت اور بیداری نصیب ہوئی۔

کے باوجود اس میں سے اتنے آدمی نہیں نکلتے جو اصلاح کے لیے کافی ہو سکیں، اور وہ قوم اپنی گود سے چند ہیرے پھینک دینے کے بعد اپنے طرزِ عمل سے ثابت کردیتی ہے کہ اب اس کے پاس کوئی ہی کوئی باقی رہ گئے ہیں تو پھر کچھ زیادہ دیر نہیں لگتی کہ وہ بھتی سلاک دی جاتی ہے جو ان کو نکلوں کو پھونک کر رکھ دے۔

[۱۱۹] یہ اس شبہ کا جواب ہے جو بالعموم ایسے موقع پر تقدیر کے نام سے پیش کیا جاتا ہے۔ اور اقام گزر شد کی جا ہی کا جو سبب بیان کیا گیا ہے اس پر یہ اعتراض کیا جاسکتا کہ ان میں اہل خیر کا موجود نہ ہنایا بہت کم پایا جانا بھی تو آخرا اللہ کی مشیت ہی سے تھا، پھر اس کا الزام ان قوموں پر کیوں رکھا جائے؟ کیوں نہ اللہ نے ان کے اندر بہت سے اہل خیر پیدا کر دیے؟ اس کے جواب میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ کی مشیت انسان کے بارے میں یہ ہے ہی نہیں کہ اس کو بھی جعلی طور پر ایک لگے بندھے راستے کا پابند بنا دیا جائے جس سے بہت کروہ چل ہی نہ سکے۔ اگر یہ اس کی مشیت ہوتی تو پھر دعوت ایمان، بعثت انبیاء اور تنزیل کتب کی ضرورت ہی کیا تھی، سارے انسان مسلم و مؤمن ہی پیدا ہوتے اور کفر و عصيان کا سرے سے کوئی امکان ہی نہ ہوتا۔ لیکن اللہ نے انسان کے بارے میں جو مشیت فرمائی ہے وہ دراصل یہ ہے کہ اس کو انتخاب و اختیار کی آزادی بخشی جائے، اسے اپنی پسند کے مطابق مختلف راہوں پر چلنے کی قدرت دی جائے، اس کے سامنے جنت اور دوزخ و دنوب کی راہیں کھول دی جائیں اور پھر ہر انسان اور ہر انسانی گروہ کو موقع دیا جائے کہ وہ ان میں سے جس را کو بھی اپنے لیے پسند کرے اس پر چل سکے، تاکہ ہر ایک جو کچھ بھی پائے اپنی سمعی و کسب کے نتیجے میں پائے۔ پس جب وہ ایکم جس کے تحت انسان پیدا کیا گیا ہے، آزادی انتخاب اور اختیار کی فروادیمان کے اصول پر من ہے تو یہ کیمے ہو سکتا ہے کہ کوئی قوم خود تو بڑھنا چاہے بدی کی راہ پر اور اللہ زبردستی اس کو خیر کے راستے پر موزد ہے۔

لَا يُؤْمِنُونَ اعْبُلُوا عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ إِنَّا عِمَلُونَ ﴿١﴾ وَأَنْتَظِرُوْا إِنَّا
مُنْتَظِرُوْنَ ﴿٢﴾ وَإِنَّهُ غَيْبُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَإِلَيْهِ يُرْجَعُ الْأَمْرُ
كُلُّهُ فَاعْبُدُهُ وَتَوَكُّلْ عَلَيْهِ وَمَا رَبُّكَ بِغَايَةٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿٣﴾

رہے وہ لوگ جو ایمان نہیں لاتے، تو ان سے کہہ دو کہ تم اپنے طریقے پر کام کرتے رہو اور ہم اپنے طریقے پر کیے جاتے ہیں، انجام کار کا تم بھی انتظار کرو اور ہم بھی منتظر ہیں۔ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ چھپا ہوا ہے سب اللہ کے قبضہ قدرت میں ہے اور سارا معاملہ اسی کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ پس اے بنی، تو اس کی بندگی کرو اور اسی پر بھروسہ رکھ، جو کچھ تم لوگ کر رہے ہو تیرارب اس سے بے خبر نہیں ہے [۱۱۲]

[۱۱۲] یعنی کفر و اسلام کی اس کشمکش کے دونوں فریق جو کچھ کر رہے ہیں وہ سب اللہ کی نگاہ میں ہے۔ بیہاں حکمت اور بردباری کی بنا پر دیروض خود ہے مگر اندر ہی نہیں ہے۔ جو لوگ اصلاح کی کوشش کر رہے ہیں وہ یقین رکھیں کہ ان کی محنتیں ضائع نہ ہوں گی۔ اور وہ لوگ بھی جو فساد کرنے اور اسے برپا کرنے میں لگے ہوئے ہیں، جو اصلاح کی سعی کرنے والوں پر ظلم و ستم توڑ رہے ہیں، اور جنہوں نے اپنا سارا زور اس کوشش میں لگا کر کھا ہے کہ اصلاح کا یہ کام کسی طرح چل نہ سکے، انہیں بھی خبردار ہنا چاہیے کہ ان کے یہ سارے کرتوں اللہ کے علم میں ہیں اور ان کی پاداش نہیں ضرور بھکتی پڑے گی۔